رجسٹرڈ ایس نمبر ۱۲۶۲

بانی : ماہرُالقادری

ماہنامہ

فاران

کراچی

ماہر نمبر

اگست ۱۹۸۶ء

مُدیر : اسمٰعیل احمد مینائی
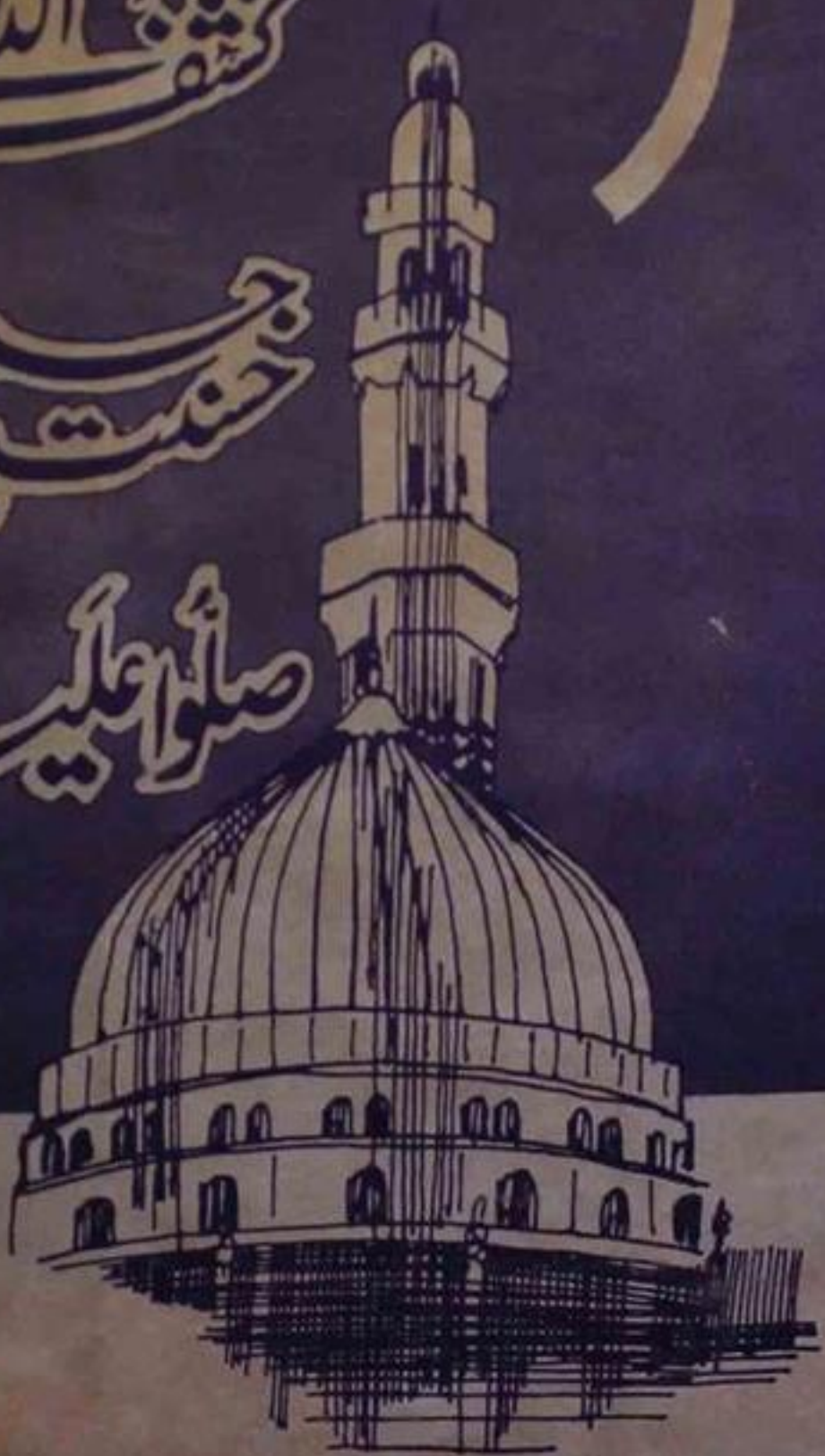
بلغ العلیٰ بکمالہ
کشف الدجیٰ بجمالہ
حسنت جمیع خصالہ
صلوا علیہ وآلہ
SILVER JUBILEE
1959 - 1984
یونائیٹڈ بینک لمیٹڈ
آپ کی خدمت کے لئے کوشاں
manhattan PAKISTAN UBL. 82.11

بانی:۔ ماہرالقادریؒ

ماہنامہ
کراچی
فاران
ماہر نمبر
رجسٹرڈ ایس نمبر ۱۲۶۳
جلد نمبر ——— ۳۷
شمارہ نمبر ——— ۱۱
اگست ۱۹۸۶ء
موجودہ شمارہ قیمت ۲۰ روپے
ایڈیٹر:۔ اسمٰعیل احمد مینائی
چندہ سالانہ پاکستان میں -/۵۰ روپے
" بھارت و بنگلہ دیش میں -/۱۰۰ "
" دیگر ممالک میں -/۲۰۰ "
قیمت فی شمارہ -/۵ روپے۔ خاص شمارہ -/۱۰ روپے
دفتر:۔ ماہنامہ فاران ۲۱۸، بہادر آباد کراچی
پبلشر:۔ ——— اسمٰعیل احمد مینائی

اس شمارے میں

پبلشر اسمٰعیل احمد مینائی نے انجمن پریس کراچی سے چھپوا کر دفتر فاران ۲۱۸ بہادر آباد کراچی سے شائع کیا فون ۴۱۶۴۴۱۲

سو لو اراتلخ ترمی زن.....

مئی ۱۹۸۶ء کے اداریے میں اسکا ذکر آچکا ہے کہ جولائی ۱۹۸۶ء کی ۱۶/۱۷ تاریخوں میں فلاح یوتھ کلب کراچی والے ماہر القادری کی یاد میں ایک دو روزہ مذاکرہ اور مشاعرہ منعقد کر رہے ہیں اُس کی کاروائی اور روئیداد کے استفادے کے بعد اب کے برس شمارہ اگست ۱۹۸۶ء..... ماہر القادری“ کا یادگاری سالنامہ ہوگا۔

سو اس روح پرور اجتماع کی مختصر داستان اور اسکی روئیداد میں سے جو مقالے، مضامین، نظمیں غزلیں فراہم ہو سکیں وہ اس شمارے میں پیش خدمت ہیں۔ پروفیسر منظر امکانی کا مقالہ پرمغز، پرمعنی اور کلام ماہر کا پہلو دار جہتوں کی نزاکتوں سے مملو اور اس عاجز کی رائے میں دو روزہ اجتماع کی اس نشست کا حاصل تھا، لیکن مفصل تھا اور اسکی نقل بھی بروقت فراہم نہ ہو سکی اسلئے وہ اس شمارے میں شامل نہیں ہے، خبر ہے کہ سیارہ (لاہور) اگلے خاص نمبر میں ”گوشہ ماہر“ کے عنوان سے کچھ صفحات مختص کر رہا ہے وہ مقالہ اسکی زینت ہوگا۔

پہلے روز کا اجتماع، شیخ الجامعہ کراچی ڈاکٹر جمیل جالبی کی زیر صدارت منعقد ہوا، پروفیسر عبدالرشید فاضل، ڈاکٹر معین الدین عقیل اور متعدد دیگر اہلِ علم نے مقالے پڑھے ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے برجستہ تقریر کی اور فاضلانہ خطبۂ صدارت کے بعد پہلا اجتماع تقریباً "۱۱ بجے شب کو بھائیوں (پہلے روز جمعیۃ الفلاح کلچر سینٹر کی سماعت گاہ سامعین سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی) کی خاطر تواضع پر ختم ہوا۔ دوسری شام کو نماز مغرب کے بعد فوراً کاروائی کا آغاز ہو گیا، ناظم مذاکرہ مسعود جاوید کے دلچسپ مضمون کے بعد نثار زبیری نے فکر ماہر کے نفسیاتی پہلو، کے عنوان سے جدید الفکر، تازہ دل توانا حسن ادا سے مملو مقالہ پڑھا جس نے حاضرین کے دلوں کو گرما دیا، بقیہ مقالات اور منظومات کے بعد راقم الحروف نے ان نکات کی مدد سے جو دو روزہ اجتماعات کے دوران نوٹ کر لئے گئے تھے مختصر صدارتی تقریر کی جو بادبور سی بیمار دونوں آنکھوں میں موتیا بند کی رکاوٹ کے باعث صفحہ قرطاس پر منتقل نہ ہو سکی۔

دوسرے اجتماع کا اختتام بھی مہمانوں کی تواضع پر ہوا اسکے بعد ماہر مرحوم کے دیرینہ دوست و رفیق تابش دہلوی کی صدارت میں بیاد ماہر“ ایک کامیاب غیر طرحی مشاعرہ منعقد ہوا جو ۳ بجے رات تک جاری رہا۔

فلاح یوتھ کلب والے، منتظمین جمعیۃ الفلاح، احباب ماہر، حاضرین یہ سب ہندوپاکستان کے جملہ اہل علم کے اور تحریک اسلامی کے شیدائیوں کے تشکر و امتنان کے مستحق ہیں کہ دیر سے سہی لیکن بہرحال ادب عالیہ اور ملت مسلمہ کے ایک سچے خادم کی یاد تازہ کرنے اور تازہ رکھنے کے لئے سلیقے سے ایک پروقار تقریب منعقد کی۔

ٹی وی/ریڈیو/اور اخبارات سب نے دونوں روز کی کاروائی میں شرکت کی لیکن پہلے دن کے اجتماع کا مختصر تذکرہ تو دو ایک اردو اخباروں میں شائع ہوا اور ٹی وی/ریڈیو کے دوسرے روز کے خبرناموں میں بھی اشارتاً اسکا ذکر آ گیا، دوسرے اجتماع کی روئیداد ہر ذریعہ ابلاغ نے یکقلم نظرانداز کی۔ غالباً اسکی وجہ یہ تھی کہ پہلے اجتماع میں صدارت بھی ایک بڑے سرکاری افسر کی تھی اور شرکا میں بھی اہم سرکاری شخصیات شامل تھے دوسرے دن کی نشست بالکلیہ نہیں تو بڑی حد تک ایسے حاضرین پر مشتمل تھی جن کا شمار نہ ارباب اقتدار و اختیار میں ہے نہ صاحبان زر و مال میں یہی غنیمت ہے کہ ذرائع ابلاغ کے نمائندوں نے شرکت کر کے اسی دوسرے اجتماع کی رونق میں اضافہ کیا ورنہ دوسرے روز حاضرین کی تعداد بھی کم تھی۔

بہرحال جو کچھ بھی ہو گیا اچھا ہی ہوا، اس مذاکرے کی روئیداد سے فاران شمارہ اگست کے مندرجات سے اور شائع شدنی سیارہ کے گوشہ ماہر کی بنیاد پر اگر ملک کے صحیح الخیال صحت مند طبقوں اور گوشوں میں ماہر القادری رحؔ ــ شخص و شاعر کو جاننے پہچاننے، سمجھنے سمجھانے کے جذبے کا احیا ہو جائے اردو کے ادب عالیہ کے لئے ہر نہج سے مفید و نفع بخش ہوگا۔ شعر و ادب کیلئے بھی ادبی رسائل کے حق میں بھی اور جدید تحقیق و تنقید کے واسطے بھی۔

اسمٰعیل احمد مینائی
۳۰ر اگست ۱۹۸۶ء

"التماس"

ماہ ستمبر ۱۹۸۶ء کے تیسرے عشرے میں اسمٰعیل احمد مینائی مدیر فاران کی داہنی آنکھ (موتیا نکالنے کے لئے) قدح کی گئی ہے، احباب و قارئین سے التماس ہے کہ ان کی بینائی کی مکمل بحالی اور عاجلانہ صحت یابی کے لئے دعا فرمائیں۔

محمد یوسف ــ مینیجر فاران

حافظ لدھیانوی

حمد باری تعالیٰ

محیطِ ہر دو عالم ہے کرم کا سلسلہ تیرا ❊ ہے کیا شانِ سخا تیری ہے کیا رنگِ عطا تیرا
زمینوں آسمانوں پر تری ہی بادشاہی ہے ❊ ہر اک موجود شے پر حکم چلتا ہے خدا تیرا
تری ہی یاد کا پرتو ہے مری خلوتِ جاں میں ❊ تصور ہو نہیں سکتا کبھی دل سے جدا تیرا
تو ہے حاجت روا سب کا تو ہے مشکلکشا سب کا ❊ یتیموں بے سہاروں کو ہے یا رب آسرا تیرا
تری ہی شانِ قدرت کے مظاہر سب مناظر ہیں ❊ ہے چرچا کو بکو تیرا ہے شہرہ جابجا تیرا
ہو روشن نور سے تیرے مرا کاشانۂ ہستی ❊ نگاہوں میں سما جائے جمالِ حق نما تیرا
پنگھوڑے میں سنائی ماں نے تیرے نام کی لوری ❊ مرے والد کے لب پر نام آیا بارہا تیرا
شگوفوں کے لبوں پر ہیں ترانے حمد باری کے ❊ لبِ گلبرگ رہتا ہے سدا نغمہ سرا تیرا

کرم کی اک نظر اس پر ہے تیرا حمد گو حافظؔ
دلِ بیتاب اس کا ہے محبت آشنا تیرا

عبدالعزیز خالد

حاط حاط

یا الٰہی! بھیج رحمت رحمۃٌ للعالمین ⁂ حضرت محمد مصطفیٰ پر جو ہیں سردار کرم فرما ہمارے
شاہِ دوراں، سرورِ دنیا و دیں ⁂ پیشوائے اولین و آخریں

روکش عرشِ بریں جن کے نقوشِ پا کی برکت سے زمیں ⁂ بھیج ان پر اپنی رحمت یا الٰہ العالمیں!
آسماں کے قمقمے جس وقت تک جلتے رہیں بجھتے رہیں ⁂ رنگ و بُو کے قافلے جس وقت تک آتے رہیں جاتے رہیں
روز و شب کا سلسلہ جس وقت تک چلتا رہے ⁂ رات دن جب تک دو رنگی اپنی دکھلاتے رہیں
اور گرماتے رہیں، جب تک دلوں کو جلوہ ہائے صبح و شام ⁂ بھیج ان پر تو تحیات و سلام
اے کہ تو نور و سلام ⁂ اے کہ تیری ذات اقدس منبع نور و سلام

یا الٰہی! مصطفیٰ خیر الوریٰ کی رُوح پاکیزہ کو پہنچا ⁂ ہم حقیروں کا درود، ہم فقیروں کا سلام
وہ کہ ہیں خیر الانام ⁂ آسماں جھک کر کرے جن کو سلام
زندۂ جاوید جن کا پاک نام ⁂ صیقلِ فکر و نظر جن کا کلام
عدل و امید و عمل جن کا پیام ⁂ بہر نفعِ عام جن کے جملہ کام
آدمی پر آدمی کی خواجگی جن کی شریعت میں حرام ⁂ رہنما ساروں کے، ساروں کے امام
جن کی عظمت کے ثنا خواں ہیں تمام ⁂ یا الٰہی! ان پہ نازل کر مدام

بے نہایت برکتیں، بے حد سلام!

نگاران

عبدالرشید فاضل

مولانا ماہر کی نعت گوئی

جس طرح لفظ "حمد" محض خدا کی تعریف کے لئے مخصوص ہے۔ لفظِ "نعت" حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح و ثنا کے لئے خاص ہو گیا ہے اور یہ بات فارسی اور اُردو میں، خواہ نثر کی کتاب ہو خواہ نظم کی، اس خصوصیت کے ساتھ بہت قدیم زمانے سے اسلامی ادب کی روایت کے طور پر چلی آ رہی ہے کہ ہر مصنف اپنی کتاب میں اوّل خدا کی حمد پھر حضورؐ کی نعت اور اس کے بعد کچھ اور لکھتا ہے۔

نعتِ رسول کی رفعتِ منزلت کا اندازہ اس بات سے کیجئے کہ خالقِ کائنات نے قرآن پاک میں جا بجا اپنے حبیبؐ کی تعریف کی ہے۔ مثلاً لقد جاءکم رسولٌ من انفسکم عزیزٌ علیہ ما عنتم حریصٌ علیکم بالمؤمنین رؤفٌ رحیم: لوگو! تمہارے پاس تم ہی میں سے ایک رسول آئے ہیں۔ جن پر تمہاری تکلیف شاق گزرتی ہے، جو تمہاری بہبود کے حریص ہیں اور جو مومنوں کے لئے رؤف اور رحیم ہیں۔ (یا) انک لعلیٰ خلقٍ عظیم = اے محمد بیشک تم اعلیٰ درجے کے اخلاق پر فائز ہو۔

غرضکہ قرآن میں کتنے ہی مقامات پر حضور اکرمؐ کی تعریف کی گئی ہے۔ ہم نے خوفِ طوالت سے صرف دو ہی مثالیں نقل کی ہیں یہی وجہ ہے کہ لوگوں نے ہر زمانے میں نعت گوئی کو اپنے لئے موجبِ شرف کا باعث اور حصولِ سعادت کا ذریعہ سمجھا۔

شاید سب سے پہلی نعت وہ ہے جو حضورؐ کے چچا ابو طالب کی طرف منسوب ہے وابیض یستسقی الغمام بوجہہ ثمال الیتامی عصمۃ...

اس کے بعد یوں تو متعدد صحابہ کرامؓ سے اشعارِ نعت مروی ہیں مگر حضرت حسان بن ثابتؓ۔ حضرت کعب بن مالکؓ۔ حضرت کعب بن زہیرؓ اور حضرت عبداللہ بن رواحہؓ ان میں سرِ فہرست ہیں اور ان کے بعد والوں کا شمار ہی نہیں ہو سکتا۔ لیکن ان میں حضرت بوصیریؒ کو بڑا قبولِ عام حاصل ہوا۔

فارسی زبان میں نعت گوئی فتحِ ایران کے بعد ہی سے شروع ہو گئی تھی اور اس زبان میں بھی ایسے نعت گو شعرا ہوئے جن کی نظیر نہیں ملتی اور متقدمین سے لے کر آج تک یہ سلسلہ جاری ہے۔ ایسے شعرا کا تو کوئی شمار ہی نہیں جنہوں نے اعتقاداً یا رسماً اپنے دواوین میں کچھ اشعارِ نعت کے بھی شامل کر دیئے۔ مگر جو حقیقتاً قابلِ ذکر ہیں یعنی جنہوں نے بتقاضائے محبتِ رسولؐ نعت کو اپنا موضوعِ سخن بنایا اور نعت کے بہتر سے بہتر شعر کہے وہ بھی کچھ کم نہیں ہیں۔ حکیم سنائیؒ۔ خواجہ عطارؒ۔ مولانا رومؒ۔ نظامی گنجویؒ۔ شیخ سعدیؒ۔ مولانا جامیؒ۔ سید حسن غزنویؒ۔ خاقانی شروانیؒ ایران میں اور امیر خسروؒ۔ فیضی۔ عرفی اور آخر میں غالب اور دورِ حاضر میں اقبالؒ برِّصغیر پاک و ہند میں۔

اُردو کا پودا چونکہ عربی اور فارسی کے پانی سے سینچا گیا ہے اس لئے اس زبان میں بھی نعت گوئی اپنے ارتقائی سلسلے

ے کرتے ہوئے اس مقام پر پہنچ گئی کہ اس کے مخصوص نعت گو شعراء، فارسی کے نعت گو شعراء سے پیچھے نہیں رہے۔ اگرچہ یہاں بھی شروع ہی سے ہر شاعر نے حضورؐ کی جناب میں ہدیۂ نعت پیش کیا ہے۔ مگر محسن کاکوروئیؒ۔ غلام امام شہیدؒ۔ شہیدیؒ۔ امیر مینائیؒ۔ امجد حیدر آبادیؒ۔ حفیظ جالندھریؒ۔ ماہر القادریؒ۔ کیف ٹونکیؒ۔ اور بہزاد لکھنویؒ نے نعت گوئی میں نام پایا اور اقبالؒ کی نعت کا تو کہنا ہی کیا!

لیکن نعت کا مقام جتنا ارفع و اعلیٰ ہے اتنا ہی حد درجہ نازک بھی ہے۔ ایسا نازک کہ ذرا سی بے احتیاطی و سہل انگاری سے آدمی کہیں کا نہیں رہتا اور یہ بے احتیاطی خواہ افراط میں ہو خواہ تفریط میں، دونوں صورتوں میں یکساں خطرناک ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بعض شعراء نے خدا اور رسولؐ میں کوئی فرق نہیں رکھا ہے اور بعض نے حضورؐ کی تعریف کا وہ طریقہ اختیار کیا ہے جو محبوبِ مجازی کے لئے اختیار کرتے ہیں۔ بتایئے کہاں محبوبِ خدا اور کہاں محبوبِ مجازی!

افراط کی مثالیں ؎

بعہدِ حکم تو امرِ قضا چناں منسوخ ٭ کہ از نزول کلام مجید محکمِ زبور

اللہ کا محبوب ہے کم پایہ نہیں ہے ٭ واں مثل نہیں ہے تو یہاں سایہ نہیں ہے۔

اللہ کے پلے میں وحدت کے سوا کیا ہے ٭ جو کچھ مجھے لینا ہے لے لوں گا محمدؐ سے

اسی طرح حضورؐ کی تعریف میں "احمدِ بے میم" اور "عرب بلا عین لکھنا۔ جب کہ حضورؐ نے خود اپنے بارے میں یہ فرمایا ہے کہ مجھے حد سے زیادہ نہ بڑھاؤ جیسا کہ نصاریٰ نے حضرت عیسیٰؑ ابن مریم کے ساتھ کیا۔ میں تو خدا کا بندہ ہوں اس لئے مجھے خدا کا بندہ اور رسول کہا کرو۔ اور تفریط یہ ہے کہ حضورؐ سے خطاب کرتے ہوئے جس طرح معشوقانِ مجازی کو کہتے ہیں، حضورؐ کو بھی بُت، سنگدل، قاتل، ستمگر، اور ہوش ربا جیسے الفاظ سے یاد کرنا۔ حالانکہ نعت گوئی کی نزاکتوں اور مشکلات کو دیکھتے ہوئے عرفی جیسے آزاد خیال کو بھی کہنا پڑا کہ ؎

عرفی مشتاب ایں رہِ نعت است نہ صحرا است ٭ آہستہ کہ رہ بر دمِ تیغ است قدم را

ہشدار کہ نتواں بیک آہنگ سرودن ٭ نعتِ شہِ کونین و مدیحِ کے وجم را

اور غالب نے کہا ہے ؎

غالب ثنائے خواجہ بہ یزداں گزاشتیم ٭ کاں ذاتِ پاک مرتبہ دانِ محمدؐ است

اور حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ نے انتہائی تعریف کی تو یہ فرمایا ؎

لَا یُمْکِنُ الثَّنَاءُ کَمَا کَانَ حَقُّہٗ ٭ بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

اس لیے کسی نے بالکل سچ کہا ہے کہ حضورؐ کی حقیقی تعریف وہ ہے جو اللہ نے کی ہے۔

پھر جن شعرا نے احتیاط سے کام لیا ہے۔ اُن میں بھی ایسے بہت کم ہیں جنہوں نے اس بات کا خیال رکھا ہو کہ حضورؐ کی سیرتِ مبارکہ اور آپ کے اُسوۂ حسنہ کا بیان کیا جائے کہ آپؐ کے تشریف لانے سے پہلے دنیا کا حال کیا تھا اور تشریف لانے کے بعد کیا ہو گیا۔ وہ بھی اتنی قلیل مدت میں کہ اس کو دیکھیے اور حضورؐ کے لائے ہوئے عالم گیر انقلاب کو دیکھیے تو حیرت کی کوئی حد نہیں رہتی۔ جیسا کہ حالیؔ نے کہا ہے۔ ؎

رہا قولِ حق میں نہ کچھ باک اُن کا ٭ بس اک شوب میں کر دیا پاک اُن کو

اس کے برخلاف حضورؐ کے ظاہری حُسن و جمال، قد و قامت، گیسو و رخسار کی تعریف بہت زیادہ کی ہے اور وہ بھی اس انداز میں کی ہے۔ جس میں وہ معشوقانِ مجازی کی تعریف کرنے کے عادی ہو چکے تھے۔ اسی طرح حضورؐ کی جناب میں التجا و التماس کی ہے تو محض اپنے لئے۔ بس اپنا حال عرض کیا ہے اور اپنی ہی اصلاح و شفاعت کو پیشِ نظر رکھا ہے۔ ملت کی حالت کیسی خراب ہے۔ مسلمانوں کے اخلاق کیسے بگڑ گئے ہیں اور یہ اپنے اخلاق و عادات ہی کی وجہ سے کیسے ذلیل و خوار ہو رہے ہیں۔ اس طرف کسی کا خیال نہیں گیا کہ ملت کی حالت بھی حضورؐ سے عرض کریں۔ جبکہ حضورؐ کو اپنی اُمت بہت زیادہ عزیز تھی۔ فارسی میں نظامی گنجویؒ اور جامیؒ نے اور اردو میں حالیؒ اور بہت زیادہ اقبالؒ نے اس بات کا خیال رکھا ہے۔

اب ہم مولانا ماہر مرحوم کی نعتیہ شاعری کا جائزہ لیتے ہیں۔ مگر پہلے اُن کی نعت گوئی کا پس منظر اُنہی کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیے۔ فرماتے ہیں:-

"اللہ تعالیٰ نے مجھے ایک ایسے گھرانے میں پیدا کیا جہاں حمد و نعت کا اکثر تذکرہ رہتا تھا۔ میرے کان میں سب سے پہلے حمد و نعت اور منقبت ہی کی آوازیں آئیں اور آج تک اُن کی بازگشت سُن رہا ہوں۔ خدا کے فضل سے ہمارے سارے گھر کو حمد و نعت سے خاص شغف تھا۔ یاد نہیں دل پر نقش یہ شعر کس کا ہے ؎

جو ہو پُل پہ لغزش کسی اُمتی کو ٭ اُسے آکے دیں گے سہارا محمدؐ

جسے میں نے اپنے بچپن میں اپنی بڑی بہن سے سُنا تھا۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ نعت رسولؐ میری گھُٹی میں پڑی تھی۔

(فاران بابت مئی ۱۹۸۲ء)

اس کے ساتھ ہی مولانا مناظر احسن گیلانیؒ کا بیان بھی سُن لیجیے۔ فرماتے ہیں:-

"حضرت ماہرؔ نے سب سے پہلے یہ کیا کہ اپنی شاعری کا رُخ اس ذات کی طرف پھیرا ہے جو زمین والوں میں محمدؐ (ستائش شدہ) اور آسمان والوں میں احمدؐ (ستائش گر) کے نام سے مشہور رہے۔ اس کے بعد اُنہوں

نے سیرتِ طیبہ کی مستند کتابوں اور احادیث کے معتبر ذخیروں سے اُن سچے واقعات کا انتخاب کیا ہے۔ جن کی توثیق و تصدیق پر محدثین اور علمائے سیر کی مُہریں ثبت ہو چکی ہیں۔ پھر انہی واقعات کو اپنے خاص بلیغ اور اچھوتے انداز میں انہوں نے نظم کا لباس پہنایا ہے۔"

(نظم ظہور قدسی کا تعارف۔ فاران بابت مئی ۱۹۸۲ء)

اب ہم مولانا ماہر کی نعت گوئی کی خصوصیات میں سے چند اہم خصوصیات کا ذکر کرتے ہیں۔

۱۔ سب سے پہلے نہایت واشگاف طور پر یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ نعت گوئی کی نزاکتوں کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے ماہرؔ ہی کی وہ شخصیت ہے جس نے حزم و احتیاط کے دامن کو اپنے ہاتھ سے کبھی نہیں چھوٹنے دیا ہے۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ ؎

برکفے جامِ شریعت برکفے سندانِ عشق ؛ ہر ہوسناکے نداند جام و سنداں باختن

یعنی عشق و محبت کے مقام پر ایسی احتیاط کہ شریعت کی بھی خلاف ورزی نہ ہو اور محبت کا بھی حق ادا ہو جائے۔ ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں ہے۔ اُردو کے تمام شعرا میں اس خصوصیت میں ماہر صاحب کا کوئی سہیم و شریک نظر نہیں آتا۔ اس میں وہ بالکل یکتا نظر آتے ہیں کہ حضورؐ کی ذاتِ گرامی کے ساتھ ایسی والہانہ محبت رکھتے ہوئے اُنھوں نے واقعی نعت گوئی کو بقول عُرفی کے دم تیغ پر چلنا سمجھتے ہوئے حزم و احتیاط کا پورا پورا حق ادا کر دیا ہے اور نعتِ سرور کونین کو مدیح و جم کے نہیں بننے دیا ہے۔ اور یہ بات اُن کو اس لئے حاصل ہوئی کہ اُن پر جہاں حضورؐ کی محبت کا غلبہ تھا وہاں احترامِ شریعت کا غلبہ بھی کم نہ تھا اور ساتھ ہی توحید کا رنگ بھی اُن پر بڑا گہرا تھا۔ چنانچہ خود فرماتے ہیں۔ ؎

کس بیم و رجا کے عالم میں طیبہ کی زیارت ہوتی ہے ؛ اک سمت شریعت ہوتی ہے اک سمت محبت ہوتی ہے

ضرورت اعتدال و ہوش کی ہے اس دورا ہے پر ؛ عقیدت کتنی رنگین ہے، شریعت کتنی سادہ ہے

توحید کے بارے میں فرماتے ہیں ؎

جس کا پیغام، پیغامِ توحید تھا ؛ کوئی حاجت روا ہے نہ مشکل کشا

صرف تنہا خدا ہے، صرف تنہا خدا ہے ؛ وہی کارساز اور وہی غیب داں

احتیاط و حزم کی مثال میں اشعار ؎

ترا ذکر جب کیا ہے تو رواں ہوئے سفینے ؛ ترا نام جب لیا ہے تو ٹھہر گئے ہیں طوفاں

تری ذات سے محبت ترے حکم کی اطاعت ؛ یہی زندگی کا مقصد، یہی اصلِ دین و ایماں

رب کی تیرے چشمۂ رحمت سے بجھتی ہے پیاس * اس میں قلزم ہو کہ دجلہ رودِ گنگا ہو کہ نیل

کوئے نبیؐ میں اس طرح جانا نہ چاہیے * اک اک قدم پہ سجدۂ شکرانہ چاہیے

جو بات وہ فرما دیتے ہیں معیارِ صداقت ہوتی ہے * دستورِ عمل بن جاتی ہے اور دین میں حجت ہوتی ہے

اے صلِ علیٰ ایک ایک ادا اللہ کی آیت ہوتی ہے * ہے روئے محمدؐ پیشِ نظر قرآں کی تلاوت ہوتی ہے

نبیؐ کا قول ہے۔ ایمان کی بنا ٹھہرا * خدائے قادر و برتر کو کس نے دیکھا ہے۔

ترے کردار کا پرتو ہے عصمت ہو کہ تقویٰ ہو * ترے اخلاق کا صدقہ ہے نیکی ہو کہ سچائی

رسولِ مجتبیٰ کہیے، محمد مصطفیٰ کہیے * خدا کے بعد بس وہ ہیں پھر اس کے بعد کیا کہیے

سلام اُس پر کہ جس کے نام لیوا اس کے شیدائی * اُلٹ دیتے ہیں تختِ قیصریت اوجِ دارائی

پیغام سناتے ہیں یہ اب تک جبریل * ہے ذاتِ محمدؐ ہی پہ ہر چیز کی تکمیل

مشیّت بھی تری مرضی کے تیور دیکھ لیتی ہے * بایں اقرارِ عبدیت یہ تیری شان ہے ساقی

شبِ معراج تو اُس بارگاہِ خاص میں پہنچا * جہاں پر ختم دورِ گردشِ ایام ہے ساقی

ترے دورِ رسالت کا تعیّن ہو نہیں سکتا * ازل آغاز ہے ساقی، ابد انجام ہے ساقی

مکان و لامکاں میں کس قدر ہے فصل کیا کہیے * مگر تجھ کو بقدرِ وسعتِ یک گام ہے ساقی

حریمِ لِی مَعَ اللہ کے کوئی اسرار کیا جانے * جہاں تو ہے وہاں اک عالمِ بے نام ہے ساقی

عالَمِ قُدس کے اسرار کوئی کیا جانے ✿ وہ ہی وہ ہیں نہ زماں ہے نہ زمیں آج کی رات
قابَ قوسین تو ہے قرب کی پہلی منزل ✿ بندہ اللہ سے اتنا ہے قریب آج کی رات
ایک ہی سطح پہ ہے مرتبۂ غیب و شہود ✿ اُٹھ گئے سارے حجاباتِ حسیں آج کی رات
در کی زنجیر بھی جنبش میں ہے بستر بھی ہے گرم ✿ رُک گئی گردشِ افلاک و زمیں آج کی رات

اب جو بات مولانا مناظر احسن گیلانیؒ نے فرمائی ہے ۔ اس پر نظر ڈالتے ہیں ۔ یعنی یہ کہ مولانا ماہر نے حضورؐ کی سیرتِ مبارکہ کے واقعات کو بڑی خوبصورتی سے بیان کیا ہے اور ان واقعات کو اُنہوں نے سیرت اور حدیث کی معتبر اور مستند کتابوں سے لیا ہے ۔ مولانا کی نظم "ظہورِ قدسی"، اُن کے نعتیہ کلام میں شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے ۔ اس میں جا بجا ایسے واقعات ملتے ہیں ۔ مثلاً ؎

سلام اُس پر کہ جس نے بیکسوں کی دستگیری کی ✿ سلام اُس پر کہ جس نے بادشاہی میں فقیری کی
سلام اُس پر کہ اسرارِ محبت جس نے سمجھائے ✿ سلام اُس پر کہ جس نے زخم کھا کر پھول برسائے
سلام اُس پر کہ جس نے خوں کے پیاسوں کو قبائیں دیں ✿ سلام اُس پر کہ جس نے گالیاں کھا کر دعائیں دیں
سلام اُس پر کہ دشمن کو حیاتِ جاوداں دے دی ✿ سلام اُس پر ابو سُفیان کو جس نے اماں دیدی
سلام اُس پر کہ جس کا ذکر ہے سارے صحائف میں ✿ سلام اُس پر ہوا مجروح جو بازارِ طائف میں
سلام اُس پر کہ جس کے گھر میں چاندی تھی نہ سونا تھا ✿ سلام اُس پر کہ ٹوٹا بوریا جس کا بچھونا تھا
سلام اُس پر جو سچائی کی خاطر دُکھ اُٹھاتا تھا ✿ سلام اُس پر جو بھوکا رہ کے اوروں کو کھلاتا تھا
سلام اُس پر جو اُمت کے لئے راتوں کو روتا تھا ✿ سلام اُس پر جو فرشِ خاک پر جاڑے میں سوتا تھا
سلام اُس پر کہ جس نے زندگی کا راز سمجھایا ✿ سلام اُس پر کہ جو خود بدر کے میدان میں آیا

بیکسوں کی دستگیری کرنا ، بادشاہی میں فقیری کرنا ، خون کے پیاسوں کو قبائیں دینا ، گالیاں کھا کر دعائیں دینا ، ابوسفیان کو پناہ دینا ، تمام صحائف میں حضورؐ کا ذکر ہونا ، بازارِ طائف میں مجروح ہونا ، پھٹا ٹوٹا بوریا آپ کا بستر ہونا ، بھوکا رہ کر دوسروں کو کھلانا ، اُمت کے لئے راتوں کو رونا ، خود بدر کے میدان میں آنا وغیرہ ۔ تمام حضور اکرمؐ کی سیرتِ طیبہ کے معتبر اور مستند واقعات ہیں ۔ جن کو ہلکے پھلکے الفاظ میں بڑی خوبصورتی سے بیان کیا ہے ۔

وہ آئے اور آئے بھی قرآں لئے ہوئے ✿ تنظیم کائنات کا ساماں لئے ہوئے

کتنے ژولیدہ مسائل تھے جدید اور قدیم ⁂ جن کو سلجھا نہ سکا کوئی مفکر نہ حکیم
اللہ اللہ نبیِ عربی کی تعلیم ⁂ کھل گئے عقدہ دشوار بہ فیضِ تفہیم

دینِ کامل ہے زمانے کی ضرورت کے لئے ⁂ اب کوئی اور نہ آئے گا ہدایت کے لئے

ہر برائی کو دیا دیس نکالا جس نے ⁂ ڈگمگاتے ہوئے انساں کو سنبھالا جس نے
آدمیت کو نئے طرز پہ ڈھالا جس نے ⁂ کر دیا مشرق و مغرب میں اجالا جس نے

خود عمل کر کے دکھایا کہ حکومت کیا ہے۔ ⁂ اصل میں رابطۂ دین و سیاست کیا ہے
جس کو اللہ کی کہتے ہیں خلافت کیا ہے۔ ⁂ آدمی چیز ہے کیا بارِ امانت کیا ہے

دین و دنیا یک جا کر کے راز ترقی کے سمجھائے ⁂ یہ بھی رحمت وہ بھی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم
ان کا گر اقرار نہ ہوگا تکمیل توحید نہ ہوگی ⁂ عینِ ایماں ان کی الفت صلی اللہ علیہ وسلم

ترے کردار پر دشمن بھی انگلی رکھ نہیں سکتا ⁂ ترا اخلاق تو ترآن ہی قرآن ہے ساقی

اب اس سے پہلے کہ مولانا ماہر کے عشقِ رسولؐ میں ڈوبے ہوئے اشعار پیش کریں پہلے ان کے عشقِ رسولؐ کا کچھ بیان کر دینا مناسب ہوگا۔ مولانا کو حضورؐ کی ذاتِ گرامی سے ایسی والہانہ محبت تھی کہ حضورؐ کا ذکر کرتے یا سنتے تو ان کی آنکھیں اشکبار ہو جاتیں۔ یہ اسی محبت کا فیضان ہے کہ ان کی ذات "ور کردے دگر گشتنے" کی بہترین مثال بن گئی اور یہ وہ بات ہے کہ ہر کس و ناکس کے حصے میں نہیں آتی۔ یہ بات بڑے حوصلے والوں کو حاصل ہوتی ہے۔ کیا یہ معمولی بات ہے کہ روزنامچے۔ انگڑائی۔ طلسمِ حیات۔ محبت بھرے خطوط۔ جب میں جوان تھا۔ حسن و شباب۔ پیمانے۔ میخانے اور کافی ہاؤس وغیرہ لکھنے والا آخری رسول۔ حضورؐ کی سیرتِ مقدسہ۔ خدا اور کائنات۔ درِ یتیم۔ کاروانِ حجاز۔ نقشِ توحید۔ قولِ فیصل۔ ذکرِ جمیل۔ فاران کے توحید و سنت پر اداریے بعنوانِ نقشِ اول لکھتا ہے چنانچہ وہ خود فرماتے ہیں:-

"میں یہ کہتے ہوئے فخر محسوس کرتا ہوں کہ میری شاعری کی ابتدا حمد و نعت سے ہوئی اور انشاء اللہ خاتمہ بھی

اسی پر ہوگا۔ مجھے اپنی فاسقانہ شاعری کا بہر حال کفارہ دینا ہے۔"

"آخری تمنا یہ ہے کہ "ذکر جمیل کا کچھ حصہ دربارِ اقدس میں حاضر ہو کر اپنی زبان سے عرض کروں اور اس کے بعد اُس جانِ حیات کے سامنے دم نکل جائے جس کے قدموں پر جان نچھاور کرنے کے لئے دی گئی ہے۔"

قرآن حکیم نے شاعروں کی دو قسمیں بتائی ہیں۔ ایک وہ جو ہر وادی میں بھٹکتے پھرتے ہیں (فی کُلِّ وادٍ یہیمون) اور جو کچھ کہتے ہیں اس پر عمل نہیں کرتے (اَنّھم یقولون ما لا یفعلون) اور دوسرے وہ جو اپنے کلام کے ذریعے لوگوں کی ہدایت و راہنمائی کا فریضہ انجام دیتے ہیں اور اخلاق و کردار کو درست کرنے کی فکر میں رہتے ہیں۔ (الّذین آمنوا و عملوا الصّالحات و ذکروا اللہ کثیراً) ایمان کے ساتھ عمل صالح کرنے والے ہی دوسروں کی راہنمائی کر سکتے ہیں۔

مولانا ماہر دوسری قسم کے شاعروں کی صفِ اوّل کے شاعر تھے۔ جیسا راسخ عقیدہ اُن کا تھا ایسا کم دیکھنے میں آیا اور ساتھ ہی عملِ صالح کے اعتبار سے بھی وہ بڑا منفرد مقام رکھتے تھے۔ انہوں نے اپنے پہلے کلام کو فاسقانہ قرار دیا یعنی فی کُلِّ وادٍ یہیمون" والے شعرا کا جیسا کلام اور طبیعت میں اسلامی انقلاب آنے کے زمانے کا کلام اُن دوسرے شعرا کا جن کی اللہ نے تعریف کی ہے اور اس کلام کو اُنہوں نے عاشقانہ کہا ہے یعنی اس کی بنیاد خدا و رسول اور اسلام کی محبت پر تھی اور زندگی کے آخری لمحے تک اُن کا یہ کلام منازلِ ترقی ہی طے کرتا رہا۔ اب سُنیئے مولانا ماہر کے محبتِ رسولؐ میں ڈوبے ہوئے اشعار جن سے تازگیِ جاں اور زندگیِ ایمان حاصل ہوتی ہے:-

حُسن کی جان ایمانِ محبت صلی اللہ علیہ وسلّم ❊ سرتاپا رحمت ہی رحمت، صلی اللہ علیہ وسلّم

سنجیدہ سنجیدہ ادائیں، شرمیلی شرمیلی نگاہیں ❊ فخرِ حیا اور نازِ غیرت صلی اللہ علیہ وسلّم

ماتھا اُن کا نور کا تڑکا، زلفوں میں رحمت کا سویرا ❊ اور تبسّم صبحِ سعادت صلی اللہ علیہ وسلّم

ماہر تو مایوس نہ ہونا دل اپنا تھوڑا مت کرنا ❊ کافی ہے بس اُن سے نسبت صلی اللہ علیہ وسلّم

ساقیِ کوثر تری دریا دلی کا ہو بھلا ❊ نظمِ ماہر بن گئی آبِ روانِ سلسبیل

درحقیقت میری بخشش کی کوئی صورت نہ تھی ❊ سچ یہ ہے ماہر کہ عشقِ مصطفٰےؐ کام آگیا

پی تو لیا ہے بادۂ حُبِّ نبیؐ کا جام ❊ اب اس کے بعد ہوش میں آنا نہ چاہئے

مری فردِ عمل پر ہے قیامت میں نظر اُن کی ❊ طلوعِ صبح ہے خود جذبِ شبنم ہوتی جاتی ہے

نبیؐ کے ذکر سے دل کو سرور ملتا ہے ✤ کہ دور رہ کے بھی کیفِ حضور ملتا ہے

او کبھی ہم کو فراموش نہ کرنے والے ✤ روحِ ماہرؔ بھی ہے موجود یہیں آج کی رات

میں سرِ حشر کچھ اس شان سے پہنچا ماہرؔ ✤ شور اُٹھا کہ محمدؐ کا غلام آتا ہے

مبارک اہلِ دنیا کو زر و دولت کی ارزانی ✤ مگر ماہرؔ کو بس کافی ترا اک نام ہے ساقی

اُنہی کی محبت ہے ایمان ماہرؔ ✤ جو کونین کا مدعا بن کے آئے

یوں تو ہر کلام کو سب سے پہلے دو ہی جہتوں سے دیکھا اور پرکھا جاتا ہے ؛ لفظی اعتبار سے اور معنوی اعتبار سے۔ لیکن نعتیہ کلام میں ان دونوں جہتوں کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہو جاتی ہے۔ معنوی اعتبار سے تو جیسا اوپر بیان ہو چکا ہے۔ اوّل حضورؐ کی تعریف میں پوری احتیاط سے کام لیتے ہوئے افراط و تفریط کے شائبہ سے بھی دور رہنا، دوسرے وہ انداز اختیار نہ کرنا جو معشوقانِ مجازی کی تعریف میں اختیار کیا جاتا ہے، تیسرے حضورؐ کی سیرتِ مبارکہ کے مستند و معتبر واقعات ہی کو بیان کرنا اور دوسری جہت جو الفاظ سے متعلق ہے۔ اس کے اعتبار سے ایک ایک لفظ، الفاظ کی ایک ایک ترکیب، ایک ایک جملہ کو بڑی وقتِ نظر سے پرکھنا کہ کلام میں کوئی ایسا لفظ تو نہیں در آیا جو نعتِ نبیؐ کے شایانِ شان نہیں ہے، مولٰنا شبلی نعمانیؒ نے سیرۃ النبی میں اگرچہ الفاظ کا انتخاب بڑی احتیاط سے کیا ہے مگر "ظہورِ قدسی" کے عنوان سے جو تھوڑی سی عبارت لکھی ہے اس کے لئے الفاظ کا انتخاب تو شاید اُردو ادب کے پورے سرمائے میں سے بڑی ہی تلاش و جستجو سے کیا ہے کہ اس وقت وہ اُس ذاتِ گرامی کی دنیا میں تشریف آوری کا بیان کر رہے تھے۔ جس کے ادب و احترام کے لئے خالقِ کائنات نے اہلِ ایماں کو یہ حکم دیا ہے کہ اپنی آواز رسولؐ کی آواز سے اونچی نہ کرنا اور اُن سے اس طرح بلند آواز سے بھی خطاب نہ کرنا جیسے تم ایک دوسرے سے کیا کرتے ہو۔ ورنہ تمہارے اعمال حبط ہو جائیں گے۔

حضرتِ کعبؓ نے قصیدۂ بانت سُعاد میں حضورؐ کی شان میں سیفٌ مِن سُیوفِ الہند (ہندوستان کی تلواروں میں سے ایک تلوار) لکھ دیا تھا۔ حضورؐ کو یہ بات پسند نہیں آئی اور فرمایا کعب! حق پرستوں کی طرح راہِ حق پر چلو اور مجھے سیفٌ من سیوف اللہ لکھو (اللہ کی تلواروں میں سے ایک تلوار) ظاہر ہے حضورؐ کا فیضان کسی خاص جگہ کی قید میں کیسے محدود ہو سکتا ہے۔ وہ تو سارے عالم کے لئے ہے۔

مولانا ماہر کی نظم "ظہور قدسی" کے الفاظ بھی ایسی ہی تلاش و جستجو سے بہم پہنچائے گئے ہیں۔ اس کے الفاظ کی نفاست و لطافت کی بھی تعریف نہیں ہو سکتی۔ ظہورِ قدسی کے علاوہ دوسرے بہت سے مقامات پر بھی ایسی ہی مرصع سازی سے کام لیا گیا ہے۔ اوّل ظہور قدسی کے کچھ اشعار ملاحظہ فرمایئے۔

سحر کا وقت ہے معصوم کلیاں مسکراتی ہیں ٭ ہوائیں خیر مقدم کے ترانے گنگناتی ہیں
مئے عشرت چھلکتی ہے ستاروں کے کٹوروں سے ٭ اُبلتی ہے شرابِ خلد مٹی کے سکوروں سے
کھبی جاتی ہے آنکھوں میں گل و لالہ کی رعنائی ٭ کہ جیسے درحقیقت خاک پر جنت اُتر آئی
لٹاتے ہیں دُرِ خوش آب گلزاروں کے فوارے ٭ خوشی سے جگمگاتے ہیں ثوابت ہوں کہ سیارے
خوشی کے گیت گائے جا رہے ہیں آسمانوں پر ٭ دُرود کے ترانے ہیں فرشتوں کی زبانوں پر
زمیں سے آسماں تک نور کی بارش ہی بارش ہے ٭ کسی کی بے نیازی آج سرگرم نوازش ہے

ایک غزل میں اپنے جذباتِ محبت کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں ۔

کیف و سرمستی کا اک پیغام رنگیں تیرا نام ٭ انبساطِ روح کی دعوت ترا ذکرِ جمیل
لحنِ داؤدی کی ہر لے تیرے نغمے کی شہید ٭ ہر ادائے حسنِ یوسف تیرے ابرو کی قتیل
تیرے ابرو حاملِ ناموسِ اسحاقؑ و ذبیحؑ ٭ تیرے عارض باعثِ رنگینیٔ باغِ خلیل
سب کی تیرے چشمۂ رحمت سے ہی بجھتی ہے پیاس ٭ اس میں قلزم ہو کہ دجلہ رود گنگا ہو کہ نیل

پاک دل، پاک نفس، پاک نظر کیا کہنا! ٭ بعد مکّے کے مدینہ کا سفر کیا کہنا!

حسن کی جانِ ایمانِ محبت صلی اللہ علیہ وسلم ٭ سرتاسر رحمت ہی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم
سنجیدہ سنجیدہ ادائیں شرمیلی نگاہیں ٭ مخزنِ حیا اور نازِ عزت صلی اللہ علیہ وسلم

عزم کا تیرے پر تو اشانِ جلالِ حیدری ٭ صبر کا تیرے آئینہ غیرت تشنۂ فرات

تیرے صدقے تو نے کی تنظیم بزمِ زندگی ٭ تیرے قربان تو نے دی ترتیب اجزائے حیات

زمانے کو رسالت پر تری ایمان ہے ساقی ٭ مگر اللعنت تری ایمان کی بھی جان ہے ساقی

آنکھ میں عرضِ تمنا کی جھلک، لب پہ درود ٭ آئے اس شان سے جبریلِ امیں آج کی رات
مسکرائے جو نبیؐ دیکھ کے جنت کی طرف ٭ اور بھی ہو گئی فردوس حسین آج کی رات

بہار اور حرم کی بہار کیا کہنا! ٭ نزولِ رحمتِ پروردگار کیا کہنا!
بس اس خیال سے پائے طلب نہ سو جائیں ٭ کبھی کبھی خلشِ نوکِ خار کیا کہنا!
ادھر سے بھی ہے نوازش کا سلسلہ ماہرؔ ٭ مآلِ جذبۂ بے اختیار کیا کہنا!

بہرحال مولانا ماہر کی خوش نصیبی بڑی قابلِ رشک ہے کہ انہوں نے ایسے ماحول میں آنکھیں کھولیں جو سرتاسر دینی تھا۔ ایسے گھرانے میں پلے اور بڑے ہوئے جہاں ہر وقت خدا اور رسولؐ کا ذکر رہتا تھا اور جہاں حمد و نعت کے ترانوں سے فضا معمور رہتی تھی۔ پھر ان کو حیدرآباد دکن میں خطیبِ اعظم نواب بہادر یار جنگؒ کی صحبت میں رہنے کا موقع ملا۔ اور مناظر احسن گیلانیؒ اور برِّصغیر کے دوسرے متبحر علماء کرام سے اُن کے روابط رہے اور آخر میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے لٹریچر کا مطالعہ کیا تو یہاں علم و عرفان کا اور ہی عالم دیکھنے میں آیا۔ لہٰذا اب وہ مولانا مودودیؒ کے عقیدت مندوں میں شامل ہو گئے۔ اور تحریکِ اسلامی کے بھی نہایت سرگرم رکن بن گئے۔ اور بڑا گراں قدر کام بھی کیا۔ دینی علوم کے مطالعہ اور دینی تعلیمات کی تبلیغ و اشاعت کے ساتھ ساتھ نعتِ سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی دنیا و آخرت کی فلاح و نجات کا ذریعہ بنالیا۔ وہ ایسے عاشقِ رسولؐ تھے کہ رسولؐ کا ذکر اُن کی جان اور نعتِ رسولؐ کے نغمے گانا اُن کا ایمان تھا۔ اور ساتھ ہی شریعت کے ادب و احترام اور حدود کو ملحوظِ خاطر رکھنے میں بھی اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ توحید اُن میں ایسی رچ بس گئی تھی کہ اُن کے ہر قول و فعل سے توحید کا نور جھلکتا نظر آتا تھا

پھر جیسا کہ مشہور ہے۔ مذہبی آدمی خشک اور کھرّا ہوتا ہے۔ مولانا اس کے باوجود کہ اُن پر مذہب کی چھاپ بڑی گہری تھی۔ بقول ایک سوانح نگار کے ایک رعنا، دل آویز اور باغ و بہار شخصیت تھے۔ بلکہ بذلہ سنج اور لطیفہ گو بھی ایسے کہ کسی مجلس میں بذلہ سنجی پر آتے تو مجلس زعفران زار بن جاتی۔ انہوں نے عربی اور فارسی کی تعلیم کسی کالج یا دار العلوم میں نہیں گھر پر ہی پائی تھی مگر اپنے وسیع مطالعے سے وہ مقام حاصل کر لیا تھا کہ بحث کرتے وقت وہ عربی و فارسی کے متبحر عالم نظر آتے تھے اور اسی طرح کتابوں پر اُن کے تبصرے بھی منہ سے بولتے تھے کہ یہ کسی بڑے محقق عالم کے تبصرے ہیں۔ وہ مشاعروں اور علمی و ادبی مجلسوں میں ہر جگہ مدعو ہوتے، جس مشاعرے میں وہ نہ ہوتے وہ سونا سونا رہتا۔ ترنم سے پڑھتے تھے اور ترنم بھی اُن کا بڑا دل کش اور موثر تھا اور جب اپنا نعتیہ کلام سناتے تو اُس وقت

اُن کا سوز و گداز قلب بھی ترنم میں شامل ہو جاتا۔ تو اب ان کا ایک ایک شعر ایک ایک مصرع تیر و نشتر کی طرح دل میں اُترتا چلا جاتا۔

غرضیکہ اُن کی زندگی یہ تھی اور اُن کی موت اُن کی زندگی سے بھی زیادہ قابلِ رشک ہے۔ جدّہ کے مشاعرے میں شرکت کے لئے گئے تھے۔ مشاعرے سے پہلے مکۃ معظمہ گئے اور عمرہ کیا۔ وہاں سے آئے تو مشاعرے میں شریک ہوئے ڈھائی بجے رات کو اپنا کلام سُنایا اور اس کے فوراً ہی بعد اپنی جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔ میت مکۃ معظمہ لے جائی گئی جہاں بیت اللہ شریف میں نمازِ جمعہ کے بعد اُن کی نمازِ جنازہ ادا کی گئی اور پھر اسی زمین میں مکۃ معظمہ کی جنت المعلیٰ میں اُن کی تدفین ہوئی۔ وہ ایک جگہ لکھتے ہیں،

"خدا شاہد ہے اور میری آشفتہ مزاجیاں اس کی گواہ ہیں کہ زندگی ہر قسم کے مرحلوں سے گزری۔ مگر کسی عالم میں بھی وہ مکہ و مدینہ کی یاد سے خالی نہیں رہی۔"

چنانچہ ۱۹۷۸ء میں وہ اپنے رسولؐ کے مولد و منشاء مکہ میں ابدی نیند سو گئے ؎

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے ؎ سبزۂ بیگانہ اس گھر کی نگہبانی کرے (اقبالؔ)

محمد ناظم ندوی

ماہر القادریؒ کی یاد میں

یاد آتا ہے ۳۰-۱۹۲۹ء میں پہلی مرتبہ کسی اُردو رسالہ میں ماہر صاحب کی غزل پڑھی تھی، یہ وہ زمانہ تھا جب میں لکھنؤ کے دارالعلوم میں زیرِ تعلیم تھا۔ دارالعلوم ندوۃ کے شبلی دارالاقامہ میں طلباء کی ایک انجمن الاصلاح تھی اس میں طلبا کا ایک دارالمطالعہ تھا جس میں اردو کی بہت سی کتابوں کا ایک مجموعہ تھا روزانہ اخبارات کے علاوہ ماہنامہ بھی آیا کرتے تھے مجھے اشعار سے ہمیشہ دلچسپی رہی ہے۔ اخبارات اور رسالوں میں غزلیں اور نظمیں پابندی سے پڑھتا تھا۔ چنانچہ اسی ادبی ذوق کی وجہ سے ماہر صاحب کو ایک شاعر کی حیثیت سے جانا۔ اس کے علاوہ مجھے ان کے متعلق مزید معلومات کچھ نہیں تھے یہ کون صاحب ہیں شاعری کے علاوہ کیا کرتے ہیں کہاں کے رہنے والے ہیں میری کم عمری کا زمانہ تھا دارالعلوم ندوہ میں نو وارد تھا۔ دارالعلوم کے ادبی حلقہ اس عہد تمام مشہور شعراء سے واقف تھے، اصغر گونڈوی، فانیؔ بدایونی، جگر مرادآبادی، جوش ملیح آبادی، حسرت موہانی اور ظفر علی خاں مدیر زمیندار کی فی البدیہہ شاعری کا بڑا چرچا تھا۔

شاہنامہ اسلام کے حفیظ جالندھری بھی دارالعلوم ندوہ کو ایک مرتبہ آئے تھے اور ان کے اشعار سُنے تھے

۱۹۴۶ء کے ماہ مئی میں ہجرت کر کے کراچی آیا تو حکیم نصیر الدین صاحب ندوی سے تعارف ہوا غالباً نظامی دوا ہی میں ماہر صاحب سے پہلی مرتبہ تعارف ہوا یہیں عبداللہ المدرسی صاحب (مرحوم) سے میری اور محبی مولانا مسعود صاحب کی ملاقات ہوئی تھی۔ ان دنوں نظامی دواخانہ اہلِ علم کا مرکزِ ملاقات تھا۔ مولانا سید سلیمان ندوی[1] پیر ہاشم جان مجددی، جناب اسمٰعیل احمد صاحب میناؔئی، مخدوم الملک میران شاہ والد مخدوم زادہ حسن محمود سابق وزیر اعلیٰ حکومت بہاولپور، سردار اجمل خاں لغاری، برادرم شاہ محمد ہاشم صاحب بہاول پوری ان کے برادر جناب سید کاظم شاہ سابق صاحب (چیف انجینئر واپڈا) اور جگر مرادآبادی وغیرہ سے اسی نظامی دواخانہ میں لوگ

---

[1] افسوس کہ دونوں کا اگست، دسمبر میں انتقال ہو گیا۔

ملاقات ہوتی تھی - ان دنوں ۴۸ء - ۴۹ء - ۵۱ء میں ماہر صاحب سے اکثر ملاقاتیں یہیں ہوتی رہیں دو چار ملاقاتوں کے بعد مرحوم سے بے تکلفی ہوگئی -

ماہر صاحب کا اس زمانہ میں قیام سعید منزل شاہراہ جناح کے قریب ایک فلیٹ میں تھا - قرب مکانی کی وجہ سے وہ اکثر ظفر احمد انصاری اور نظامی دواخانہ آیا جایا کرتے تھے - محبی حکیم نصیر الدین صاحب اپنی مہمان نوازی، خوش خلقی اور بذلہ سنجی اور شستہ وشائستہ زبان کی وجہ سے حلقۂ احباب میں بڑے محترم ہیں اپنی گوناگوں خوبیوں کی وجہ سے بہت جلد کراچی میں بلکہ سندھ میں مشہور ہوگئے - میں بھی کبھی کبھی یہیں دعوت کرتا تھا ان دعوتوں میں اہل علم حضرات شریک ہوتے تھے اکثر دعوتوں میں ماہر صاحب بھی شریک ہوتے تھے - رفتہ رفتہ ماہر صاحب سے دوستی اور بے تکلفی پیدا ہوگئی - یہ سب جانتے ہیں کہ مرحوم کو لذیذ غذاؤں کا بڑا ذوق تھا - بے تکلف اچھے کھانے کی یا خاص قسم کے کھانے کی فرمائش اشارۃً کرتے خود بھی جب اپنے ہاں احباب کو مدعو کرتے تو بڑا پر تکلف دسترخوان ہوتا -

ایک مرتبہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ لاہور سے آئے ہوئے تھے مولانا مودودیؒ اور ہم سب کی انہوں نے دعوت کی اس میں مجھے یاد آتا ہے عبداللہ المسدوسی، حکیم نصیر الدین ندوی نظامی دواخانہ کراچی اور انصاری صاحب جناب اسمٰعیل احمد مینائی وغیرہ اور راقم السطور شریک تھے - اس دعوت طعام کی خصوصیت یہ تھی کہ مچھلی کا پلاؤ تھا - مچھلی کا قورمہ تھا، مچھلی کے کباب تھے - الغرض مچھلی ہی مچھلی تھی — غالباً" ۶۰ء، ۶۱ء کا زمانہ تھا صدر پاکستان ایوب خان مرحوم کے مارشل لاء کا دور تھا سیاسی زندگی معطل تھی - بہاول پور کے دینی ذہن رکھنے والے طلباء نے میرے مشورے سے سیرت کے جلسے کا انتظام کیا، جلسہ گاہ بہاول پور کی مسجد صادق تھی اس کے وسیع صحن میں پنڈال بنایا تھا - پاکستان کے طول وعرض سے ہر طبقہ کے مقررین کو دعوت دی گئی تھی مولانا عبدالستار خان نیازی، علاؤ الدین صدیقی صدر شعبہ فارسی پنجاب یونیورسٹی جو بعد کو وائس چانسلر کے عہدہ پر بھی فائز ہو کر ریٹائرڈ ہوئے تھے - جناب کوثر نیازی ان دنوں وہ اپنی محسن جماعت اسلامی سے علیحدہ نہیں

ہوئے تھے، کراچی سے جناب عبداللہ المسدوسی، محترم جناب ظفر احمد انصاری، جناب ماہر القادری برادر گرامی مولانا عبدالقدوس ہاشمی ندوی وغیرہ کو دعوت دی گئی تھی، جلسہ در یا تین دنوں تک ہوتا رہا بڑا کامیاب جلسہ تھا دن رات میں کئی نشستیں ہوتی تھیں، مقررین کی کثرت کی وجہ سے وقت کی تنگی کی مقررین کو شکایت بھی تھی سیاسی گھٹن کی وجہ سے اس دینی جلسہ میں شرکت کا موقع ملا تو بڑی کثرت سے لوگ شریک ہوئے -

ماہر صاحب نے نعت وقرآن پر اپنی مشہور نظم ترنم کے ساتھ سنائی ماہر صاحب خوش گلو بھی تھے اور خاص کیف وجذب کے ساتھ شعر سناتے تھے - ماہر صاحب ایک اچھے مقرر بھی تھے نہایت سلجھی ہوئی مرتب تقریر کرتے تھے -

جن دنوں سیرت کا جلسہ ہو رہا تھا - بھاول پور میں بیڑوں کے شکار کا زمانہ تھا - بازار میں جابجا بیڑوں کی دکانیں لگی ہوئی تھیں اور بیڑوں کی بہار آئی ہوئی تھی کیا ارزانی کا زمانہ تھا ایک روپیہ ۲ آنے میں تین بیڑیں مل جایا کرتی تھیں ورنہ روپیہ کی ۲ بیڑیں آسانی سے دستیاب ہو جایا کرتی تھیں - ماہر صاحب نے ایک دکان سے گزرتے ہوئے کہا کیا یہ ادھر اُدھر نہیں آسکیں میں مطلب سمجھ گیا کہ یہ شاعرانہ کنایہ میں حسن طلب ہے۔
چنانچہ مرحوم کی بیڑوں سے تواضع کا میں نے اپنے غریب کدہ پر انتظام کیا۔

ماہر صاحب بلند شہر یوپی کے ایک قصبہ کے رہنے والے تھے - ہند و پاک کے مشہور عربی زبان کے ادیب لغوی ونحوی جناب خلیل عرب صاحب سے انہوں نے تھوڑی سی عربی بھی پڑھی تھی، علوم دینیہ کی باضابطہ تعلیم نہیں پائی تھی مگر اپنے وسیع مطالعہ کی وجہ سے قرآن کریم اور احادیث کے تراجم سے نیز سیرت النبیؐ، اسوۂ صحابہؓ اور سیرت صحابہؓ وغیرہ نیز تاریخ اسلام کے مطالعہ کی بدولت ان کی دینی معلومات اچھی خاصی تھیں وہ صحیح العقیدہ اور بدعات سے نفور تھے۔

جماعت اسلامی کے سربراہ مولانا مودودی مرحوم کی کتابوں کے مطالعہ کی وجہ سے وہ جماعت اسلامی سے بہت قریب ہو گئے تھے بلکہ اس کے مخلص حامی تھے اور اپنے قلم و زبان سے جماعت کی مدافعت و حمایت کرتے تھے آخر میں ملک کے سیاسی حالات اور بے دین قائدوں کے تلون سے ان کو شدید روحانی تکلیف ہوتی تھی۔

حیدر آباد دکن میں ایک عرصہ تک قیام کی وجہ سے ان کے حلقۂ احباب میں بڑی کثرت سے وہاں کے مہاجرین بھی تھے مرحوم کا حلقہ احباب بڑا وسیع تھا شعر و سخن، صحافت کے حوالہ سے اکثر شعراء ادباء اور صحافیوں سے ان کے ذاتی مراسم بھی تھے اور بہتوں سے دوستانہ تعلقات قائم تھے دین سے اور جماعت اسلامی سے تعلقات کی وجہ سے علماء اور سیاسی کارکنوں سے بھی ان کے مراسم قائم ہو گئے تھے - لہذا کراچی میں کسی دینی، سیاسی، یا ادبی محفل میں ان کی شرکت گویا یقینی ہوتی تھی جس محفل میں وہ کسی وجہ سے شریک نہیں ہوتے تو احباب ان کی کمی شدت سے محسوس کرتے تھے محفل میں یاد کئے جاتے تھے - افسوس ہے دفعتہً اس طرح بھری محفل سے اٹھ گئے کہ عرصہ تک ان کے سانحہ ارتحال کا یقین نہیں ہوتا تھا۔

وہ ایک نغز گو، قادر الکلام شاعر تھے ان کے شعری مجموعہ سے ان کی شاعری کا اندازہ کیا جا سکتا ہے وہ ایک شگفتہ نگار ادیب و نثر نویس اور نقاد تھے - کراچی سے انہوں نے جب رسالہ فاران شائع کیا تو انہوں نے شعراء کے مجموعۂ کلام پر تنقیدیں بھی کیں نیز دوسری مؤلفات پر بھی وہ تبصرہ کیا کرتے تھے وہ ایک بے لاگ تبصرہ نگار اور نقاد سخن تھے زبان و ادب، محاوروں اور امثال پر ان کی بہت اچھی نظر تھی ان کی اکثر گرفت اور تنقید صحیح ہوا کرتی تھی - مولانا سید سلیمان ندوی رح بھی ان کی تنقید اور ادبی گرفت کی تائید کیا کرتے تھے - مرحوم سے میرے بھی دوستانہ تعلقات قائم ہو گئے تھے وہ دوستوں کے مخلص دوست تھے ان کی معاشی حالت کی فکر رہا کرتی تھی۔

ازراہِ محبت وتعلق میرے بڑے لڑکے علی کاظم سلمہ سے ان کی تجارت کے متعلق دریافت کیا کرتے تھے۔

"فاران" کا ایک اپنا حلقہ تھا ماہر صاحب کے اداریہ اور یادِ رفتگان اور تنقیدی مضامین کی وجہ سے اس کے ہر نمبر کا انتظار رہتا تھا۔ میں ان کے تنقیدی مضامین پابندی سے پڑھا کرتا تھا۔ وہ بڑی محنت اور مطالعہ کر کے مضمون لکھا کرتے تھے عربی الفاظ کی تحقیق کے سلسلے میں کبھی فون سے اور کبھی خود میرے غریب کدہ پر تشریف لاتے اور تحقیق کرتے۔ جناب ظفر احمد انصاری کے دولت کدہ پر بھی وہ عموماً "دینی و علمی گفتگو کرتے رہتے۔

جوش ملیح آبادی مرحوم نے جب "یادوں کی برات" لکھی تو اس کا ایک نسخہ غالباً اشاعت کے کچھ عرصے کے بعد ان کو بھی بھیجا، جوش صاحب کو معلوم تھا کہ ماہر صاحب ضرور تبصرہ کریں گے اور ہر قسم کی گرفت بھی ہوگی چنانچہ "یادوں کی برات" کے ساتھ جو ان کے نام خط لکھا تھا اس میں لکھا تھا۔ حاضر ہے۔ ذبح کیجئے!

ذبح کرنے کا لفظ اسی خوف تنقید اور ان کی گرفت کی غمازی کرتا ہے۔ چنانچہ ماہر صاحب نے وہی کیا جس کا مولف کو خطرہ تھا بڑا مفصل تبصرہ کیا۔ خوب خوب تنقید کی، اسی طرح کیانی مرحوم مشہور طول گو، قادر الکلام ہر قسم کے الفاظ نظیر اکبرآبادی کے طرز پر استعمال کرنے والے شاعر کے کلام پر انہوں نے تبصرہ کیا اور گرفت بھی کی غالباً اسی وجہ سے وہ ماہر مرحوم سے بدگمان ہو گئے تھے، بہر حال ہم عصری کی چشمک کا بھی شائبہ ہو سکتا تھا۔

ماہر صاحب کی حلقۂ احباب میں ایک دلآویز و محبوب شخصیت تھی، بڑی کثرت سے وہ تقریبوں میں، ادبی محفلوں میں، مشاعرہ کی مجلسوں میں مدعو ہوتے اور لطیفہ گوئی بذلہ سنجی کی وجہ سے شمعِ محفل بن جاتے ان کی ذات خود ایک انجمن تھی، حیدرآباد دکن میں ایک عرصہ تک قیام کی وجہ سے وہاں کے آدابِ محفل سے واقف تھے مگر ان کی زبان پر وہاں کے اثرات نہیں تھے۔ مدراس کے ایک مشاعرے کے ذکر کے سلسلے میں ایک بذلہ سنجی کا قصہ یار بار ان کی زبان سے لوگوں نے سنا تھا جس کا ذکر جلسے کے داعی کیا کرتے تھے۔

جب رات بھیگ گئی اور نصف شب ہوا چاہتا تھا ازراہِ محبت وتواضع فرمایا رات بہت گزر گئی ہے ورنہ ابھی مزید آپ کے ساتھ صحبت کرتا۔ ساری محفل کشتِ زعفران بن گئی انہی کی زبانی معلوم ہوا کہ مدراس میں کسی اچھے شعر کی یوں داد دیتے ہیں کیا سُور شعر کہا ہے۔ غالباً پرشکوہ الفاظ کی وجہ سے سُور سے تشبیہ دی جاتی ہوگی۔ کسی کائستھ کا لڑکا ایران گیا وہاں سے اپنے والد چھیدی لال نامی کو خط لکھا بنام مکرم جناب سوراخ سرخ صاحب ڈاکیہ محلہ میں دریافت کرتا پھرا کہ سوراخ سرخ نامی کون بزرگ ہیں ایک صاحب کائستھی فارسی کے رمز آشنا تھے فرمایا ارے یار یہ چھیدی لال کے بیٹے نے خط لکھا ہے۔ ماہر صاحب کے لطیفے اب بھی یاد آتے ہیں تو تبسم کی لہر ہونٹوں پر دوڑ جاتی ہے۔

دراز قامت، دوہرا بدن عموماً شیروانی، فاختہ پائجامہ پہنتے، دہلی ٹوپی یا رام پوری کشتی نما ٹوپی اوڑھتے جہاں جاتے احترام و عزت سے لوگ پیش آتے۔

انتقال سے چند سال قبل سال میں ایک مرتبہ تمام احباب و اعزہ و اقربا کو کھانے پر بلاتے یہ صرف تقریب ملاقات ہوتی، پُرتکلف دعوت کا اہتمام کرتے تھے۔ اس دعوت میں اکثر احباب سے ملاقات ہو جاتی۔ مرحوم کا حلقہ احباب بہت وسیع تھا، شعراء ادباء، نامہ نگار، مدیران جرائد، سیاسی حضرات سرکاری ملازمین وغیرہ اس دعوت طعام میں شریک ہوتے سو وہ کیا رخصت ہوئے محفل بے رونق اور سونی ہو گئی اور تقریب ملاقات کا وہ سلسلہ ختم ہو گیا۔

فریضۂ حج ادا کرنے کے بعد دین کا رنگ غالب آ گیا تھا۔ خشخشی داڑھی بھی رکھ لی تھی، پابند صوم و صلوٰۃ تو پہلے بھی تھے حج کے بعد ذرا زیادہ اہتمام کرنے لگے تھے۔

ایام حج میں جو وجد آفریں اشعار کہے تھے ترنم کے ساتھ جب سناتے تو شرکاء مجلس پر ایک وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ کے نقشہ پر پرسوز ترنم کے ساتھ ماہر صاحب کا پڑھنا آج بھی یاد آتا ہے تو مرحوم کی یاد تازہ تازہ ہو جاتی ہے۔

ایک ادبی محفل میں شرکت کی غرض سے جدہ گئے محفل مشاعرہ میں ایک مشہور شاعر کا ایک تمسخر آمیز شعر سن کر بے تاب ہو گئے مائیک پر اس کا جواب دیا واپس آ کر ایسے بیٹھے کہ پھر نہ اٹھے، جان جان آفریں کے سپرد کر دی اور جنت المعلیٰ میں مدفون ہوئے جہاں ہر مسلمان مر کر دفن ہونے کی تمنا کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دیارِ حبیب میں مدفون ہونے کا یوں انتظام فرمایا۔ سبحان اللہ۔

اللہ تعالیٰ مرحوم کی غلطیوں کو معاف فرمائے، ان کے حسنات کو قبول فرمائے اور اپنے جوار رحمت میں جگہ دے (آمین) ایسا محسوس ہوتا ہے کہ چونکہ ماہر صاحب کا قلم رد بدعت اور دعوت سنت میں بڑا اجری تھا اللہ نے ان کے مساعی کو قبول فرمایا۔ ایک صاحب نے جو ان سے تعلق رکھتے تھے مرحوم کے انتقال کے کچھ دنوں بعد انہیں خواب میں دیکھا کہ وہ کلاہ اور عمامہ باندھے ہوئے سید منزل شارع جناح کے پاس سے گزر رہے ہیں پوچھا کہاں جا رہے ہیں پہلے تو ایک شعر پڑھا جس کا پہلا مصرعہ صاحب خواب بھول گئے دوسرا مصرعہ یہ تھا کہ ؎ "بیٹھے بیٹھے میری تدفین ہو گئی" یعنی کنایہ تھا اپنی موت کا پھر بتایا کہ اسلامیہ کالج جا رہا ہوں۔ اسلامیہ کالج کے ایک گوشہ میں اس عہد کے دو بڑے عالم دین حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رح اور حضرت مولانا سید سلیمان ندوی رح خلیفہ مولانا اشرف علی تھانوی رح مدفون ہیں۔ اس ہیت میں وہاں جانے کا ارادہ شاید ان کے مقبول بارگاہ ہونے کی طرف اشارہ ہو۔

ماہنامہ "فاران" بڑی محنت سے نکالتے تھے اس کے لئے بڑا مطالعہ کرتے تھے اس کا ادبی معیار بلند تھا اس کے بعض خصوصی نمبر بڑے مفید ثابت ہوئے توحید نمبر۔ بڑا وقیع تھا اس میں ملک کے نامور اہل قلم

اور علماء نے حصہ لیا تھا۔

مجھ جیسے کوتاہ قلم سے بھی اصرار کرکے توحید نمبر پر ایک مختصر سا مضمون لکھوایا۔ بعد کو موصوف نے بیان کیا کہ فاران کا توحید نمبر نہ صرف پاکستان میں بلکہ ہندوستان میں بھی ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور لوگوں نے خوب پڑھا مجھ سے ایک مرتبہ فرمایا آپ کا مختصر مضمون پسند کیا گیا کیونکہ بہت جامع تھا حیدر آباد دکن میں اسکو پمفلٹ کی شکل میں دو بار شائع کیا گیا غالباً دوسرے اچھے مضامین کو بھی پمفلٹ کی شکل میں شائع کیا گیا ہوگا۔

مرحوم کی کوئی اولاد نہ تھی اپنے بھائی جناب مسرور حسن صاحب کی اولاد کو اپنی اولاد کی طرح پالتے تھے مرحوم کے احباب جب تک زندہ رہیں گے ان کا ذکرِ خیر ہوتا رہے گا۔ حق مغفرت کرے بڑی خوبیوں کے آدمی تھے۔

امید ہے ماہر القادری مرحوم کے مخلص ترین دوست جناب اسمٰعیل احمد مینائی صاحب کی ادارت میں ان شاء اللہ یہ رسالہ پہلے کی طرح اپنا معیار بلند قائم رکھے گا ——— اور ان کی علمی یادگار عرصے تک باقی رہے گی۔

بقیہ "سُن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا"

رہتے ہیں۔ اُن کی شاعری اور فن پر تین مبسوط مقالے لکھ کر شائع کرا چکا ہوں لیکن مجھے بھی آج تک یہ معلوم نہیں تھا کہ اصغر مرحوم تنقید کے معاملے میں بھی ایک عہد آفریں شخصیت تھے۔ دراصل بقول ڈاکٹر اقبال احمد خاں "حالات ان کی شہرتِ عام کے لئے سازگار نہ ہو سکے" لوگ ان کی شاعری کے بارے میں بھی بہت کم جانتے ہیں درحقیقت زمانے اس دور میں بڑی تیزی سے رنگ بدلتا رہا ہے اور بقول اصغر یہ حال ہوگیا ہے کہ "پہچانی ہوئی صورت بھی پہچانی نہیں جاتی"

آخر میں ایک جملہ "تلملانا اور جھلملانا" کے بارے میں مجھے آپ کی تشریح سے مکمل اتفاق ہے البتہ یہ اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ "تلملانا" انسانی جذبات کی کیفیت ہے اس لئے صرف انسانی جذبات کی عکاسی کے لئے استعمال ہو سکتا ہے اور "جھلملانا" بے جان اشیاء کی صورتگری ہے اس لئے صرف بے جان چیزوں کے لئے استعمال ہو سکتا ہے۔

والسلام

نیاز مند اسرار احمد سہاوری

ڈاکٹر فرمان فتح پوری

مولانا ماہر القادری کی غزل گوئی[1]

مولانا ماہر القادری، بیسویں صدی کے اُن شعراء میں سے ہیں جنہوں نے اوّل اوّل اپنی خوش گلوئی کی بدولت شہرت پائی، اور مشاعروں کی موفقت جانے گئے۔ پھر مطالعہ و محنت نے ان کے اسلوب شعری میں جانداری اور ان کے اندر خود اعتمادی پیدا کی اور ان کا شمار، ہم عصر شعراء کی صف اوّل میں شامل ہوگیا۔ ان کی دینداری، خوش اخلاقی، اظہار خیال میں جرأت مندی اور مزاج میں شگفتگی نے ان کی شہرت اور مقبولیت میں مزید اضافہ کیا۔

پاکستان پہنچ کر، انہوں نے "فاران" نامی ماہنامہ پرچہ نکالا اور اپنے ساتھ اسے بھی تحریک اسلامی سے منسلک کر دیا کہ شروع ہی سے ان کا رجحان اسی طرف تھا۔ پھر بھی انہوں نے فاران کو محض تبلیغی یا سیاسی پرچہ نہیں بننے دیا جس حد تک ممکن ہو سکا ادبیات سے بھی منسلک رکھا۔ ادبیات میں زبان کے مسائل سے انہیں خاص دلچسپی تھی۔ چنانچہ، املا، رسم الخط، لغت اور قواعد سے متعلق انہوں نے خود بھی متعدد مضامین لکھے اور دوسروں سے بھی لکھوائے۔ ان مسائل پر ان کے محاکمے بڑے دلچسپ اور معلومات افزا ہوتے تھے کتابوں پر تبصرے بھی وہ عموماً مفصّل کرتے تھے۔ پہلے ہر کتاب کی خوبیوں پر روشنی ڈالتے تھے۔ پھر باقاعدہ عنوان دے کر اس کا دوسرا رُخ یعنی خامیاں گنواتے تھے۔ ان کے اس اندازِ تنقید نے زبان و بیان کی حد تک نئے لکھنے والوں کی رہنمائی کی اور بہتوں کو زبان و بیان کی لغزشوں سے آگاہ رکھا۔

مولانا ماہر القادری نے صرف ادبی و تنقیدی مضامین ہی نہیں بلکہ افسانے، ناول اور سیکڑوں طویل اداریے بھی لکھے لیکن یہ سب چیزیں بہت جلد پردۂ خفا میں چلی گئیں۔ البتہ شاعر کی حیثیت سے ان کا نام آج بھی زندہ ہے کہ ان کی اصل شناخت و شہرت ان کی شاعرانہ صلاحیتوں ہی کے دم قدم سے قائم تھی۔ شاعری میں انہوں نے حبّ رسول ﷺ سے سرشار ہو کر نعتیں بھی کہیں اور ان کی نعتیں ان کے ترنم کے سبب

---

[1] جمیعت الفلاح کراچی میں مولانا ماہر القادری کی یاد میں منعقد ہونے والے مذاکرے کی تقریر جسے بعد میں مقرر نے خود تلخیص کرا دیا ——————— (ادارہ)

خاصی مقبول بھی ہوئیں۔ ان کا وہ رنگِ سخن جسے انہوں نے علامہ اقبال کی تقلید میں اپنایا تھا، محفل اور جلسے کی حد تک تو کارآمد رہا لیکن جب اسے خالص شعری و ادبی نقطہ نظر سے دیکھئے تو اس میں وہ جان یا قوت نظر نہیں آتی جو ان کی غزلوں میں ہے۔

سچ یہ ہے کہ مولانا، بنیادی طور پر غزل اور صرف غزل کے شاعر تھے۔ تغزل سے ان کے مزاج کو خاص مناسبت تھی۔ اشعار میں فکر و خیال کی زیادہ بلندی یا گہرائی نہ سہی، لیکن زبان و بیان میں ایسا والہانہ پن ہے کہ ان کی غزل تاری اور سامع کو چونکائے بغیر نہیں رہتی۔ ان کا انداز غزل گوئی، کہیں کہیں جگر مرادآبادی کے رنگِ تغزل سے ہم آہنگ نظر آتا ہے۔ وہ یقیناً جگر سے متاثر تھے لیکن جگر کا مرتبہ بحیثیت غزل گو مولانا ماہر سے بڑا ہے۔ پھر بھی مولانا اپنے ہم عصر غزل گو شعرا میں ایک ممتاز مقام کے مالک ہیں۔

اردو شاعری میں، غزل کی دو خاص روایتیں ملتی ہیں۔ ایک وہ جو فکر و خیال کی رفعتوں کے ساتھ آگے بڑھتی ہے اور دوسری وہ جس میں فکر و خیال سے زیادہ زبان اور زبان کو برتنے کا سلیقہ، اپنا جادو جگاتا ہے۔ اس دوسری روایت کے آخری نمائندوں میں داغ، امیر مینائی، ریاض خیرآبادی، جلیل مانکپوری اور مضطر خیرآبادی خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ مولانا ماہر القادری اسی روایت کے نمائندے تھے۔ انہوں نے اقبال کے رنگ میں کہنے کی بہت کوشش کی لیکن بوجوہ اس میں کامیاب نہ ہوئے۔ ہاں زبان کو سلیقے سے برتنا وہ خوب جانتے تھے اور اسی کی بدولت معمولی خیالات اور عام جذباتِ انسانی کو ایسا شعری پیکر دے جاتے تھے کہ ان کے اشعار بہ اعتبار اثر و اسلوب دوسروں سے بالکل منفرد ہو جاتے تھے۔ مولانا کے اس وصف خاص کا اندازہ کرنا ہو تو ان کے اشعار پر نظر ڈالئے جن میں کوئی خیال یا مضمون بظاہر نیا نہیں ہے بلکہ اسے متعدد شعرا نے اپنے اپنے انداز سے بیان کیا ہے لیکن جب اسی خیال یا مضمون کو مولانا ماہر نے ہاتھ لگایا تو اس کا اثر کچھ سے کچھ ہو گیا ہے۔

اردو شاعری میں محبوب کی بے اعتنائی اور بے رخی کا شکوہ عام ہے، لیکن بعض شعرا نے جب محبوب کے تصور کا رُخ زمین سے آسمان کی طرف کر دیا ہے تو ان کے اس نقطۂ نظر میں حیرت انگیز تبدیلی آ گئی ہے۔ اور انہوں نے محبوب کو ستمگر و ستم شعار کہنے کے بجائے محبت و رحم و کرم کا مجسمہ قرار دیا ہے اور اس کی شانِ کریمی کو سراہتے ہوئے نہایت خوبصورت اشعار نکالے ہیں۔ اس وقت حافظے کی مدد سے صرف چند اشعار کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں۔

مثلاً محبوبِ حقیقی کے الطافِ کریمانہ کے موضوع کو لے لیجئے ۔

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لئے ÷ قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے (اقبال)

سُنا ہے حشر میں شانِ کریم بے تاب نکلے گی ؛ لگا رکھا ہے سینے سے متاعِ ذوقِ عصیاں کو

(اصغر)

اک نظر اور تری شانِ کریمی کے نثار ؛ یاد عصیاں کی ابھی دل سے فراموش نہیں

(اثر لکھنوی)

یہ مانا بھیجدے گا مجھ کو محشر سے جہنم میں ؛ مگر جو دل پہ گزرے گی وہ دل ہی جانتا ہوگا

(جگر)

محشر میں میرا دامن اب چھوڑتے نہیں ہیں ؛ اللہ یہ وہی ہیں جن کو ترس گیا ہوں

(فراق)

ملا جو موقع تو روک دوں گا جلال روزِ حساب تیرا ؛ پڑھوں گا رحمت کا وہ قصیدہ کہ ہنس پڑے گا عتاب

(جوش)

اقبال، اصغر، اثر، جگر، فراق اور جوش کے یہ اشعار اپنے اپنے رنگ میں خوب نہیں بہت خوب ہیں اور ان کا مرکزی خیال ایک ہی ہے اور ان کی موجودگی میں اس خیال پر مبنی کوئی اچھا شعر کہنا آسان تھا لیکن مولانا ماہر القادری" کو چونکہ اس خیال سے طبعاً مناسبت و عقیدت ہے اس لئے انہوں نے اسے اپنے خاص انداز میں نظم کیا اور اردو شاعری کو ایک ایسا خوبصورت شعر دیدیا ہے جو تادیر یاد رکھا جائے ماہر کا شعر سنتے چلیے۔

مجھ کو ڈر ہے کہیں رحمت نہ پریشاں ہو جائے
لوگ اس درجہ گناہوں سے پشیماں کیوں ہیں

یہاں چراغ سے چراغ یقیناً جلایا گیا ہے لیکن ماہر کے چراغ کی روشنی سب سے الگ اور منفرد ہے۔

ایک اور مثال دیکھئے - اردو شاعری میں، محبوب کے التفات کو ہمیشہ شک و شبہ اور حیرت و تعجب کی نظر سے دیکھا گیا ہے - مختلف وجوہ سے چونکہ محبوب، عاشق کی طرف سے عموماً بے نیازانہ ہی گزرا ہے، اسی لئے اگر کبھی اسکی طرف سے دلجوئی و نرم خوئی کا مظاہرہ ہوتا ہے تو عاشق کو اس کے اس عمل پر یقین نہیں آتا بلکہ وہ اسے ایک نئے اور پر فریب طرزِ ستم سے تعبیر کرتا ہے - غالب کا مشہور شعر

مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا دورِ جام ؛ ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

فانی نے کہا ہے۔

کچھ بھی ہوں برق و باراں ہم تو یہ جانتے ہیں ؎ اک بیقرار تڑپا اک بیقرار رویا

عندلیب شادانی کے لفظوں میں۔

تری محبت کا بھی یقیں ہے تری وفاؤں کو مانتا ہوں ؎ مگر مرا دل لرز رہا ہے میں اپنی قسمت کو جانتا ہوں

یہ اشعار اپنے موضوع پر بڑے خوبصورت اشعار ہیں اور اب اسے ہاتھ لگانا خطرے سے خالی نہ تھا لیکن مولانا ماہر نے اپنے تجربے کی بنیاد پر، اس پر طبع آزمائی کرنے پر خود کو مجبور پایا اور اپنی قادر الکلامی کی بدولت ایسا شعر کہہ گئے جو مذکورہ بالا اشعار سے کسی طرح کمتر درجے کا نہیں ہے، بلکہ دوسرے مصرعے کے آخری ٹکڑے نے اسکی فضا کو مزید حسین و خوشگوار بنا دیا۔ ماہر کا شعر ہے۔

مرے حال پر اور اتنی نوازش ؎ وہ کیوں مہرباں ہیں خدا کو خبر ہے

اردو کی عشقیہ شاعری میں، محبوب کا نقابِ رخ بھی، ہمارے شعرا کا خاص موضوع رہا ہے شاید ہی کوئی شاعر ہو جس نے اسے موضوع سخن نہ بنایا ہو، گویا موضوع بہت پامال ہے لیکن ماہر القادری نے فرسودہ مضمون کو بھی اپنے انداز غزل سرائی سے تازہ بنا دیا، ان کے دو شعر دیکھئے اپنے طرز بیان اور زاویہ خیال کے اعتبار سے کیسے دلکش و جاں نواز ہیں ؎

نقابِ رخ اٹھایا جا رہا ہے ؎ وہ نکلی دھوپ سایہ جا رہا ہے

اس طرح اٹھ رہا ہے ترا گوشۂ نقاب ؎ جلوے بھی کامیاب نگاہیں بھی کامیاب

جدائی اور فراق کا عنوان بھی عاشقانہ شاعری میں بہت پسندیدہ رہا ہے اور عاشق کے لئے محبوب کی آمد یا موجودگی کے سوا کوئی اور سامانِ عشرت و آرائش کبھی تسکین کا وسیلہ نہیں بن سکا۔ محبوب کے بغیر جلوت و خلوت کا ہر عالم، عاشق کے لئے ویران و بے جاں رہا ہے۔ میر تقی میر نے کہا ہے سو

آئی بہار گلشن، گُل سے بھرا ہے لیکن ؎ ہر گوشۂ چمن میں خالی ہے جائے بلبل

غالب کے الفاظ میں۔

تھی وہ اک شخص کے تصور سے ؎ اب وہ رعنائی خیال کہاں

فانی بدایونی کا شعر ہے

کوئی چٹکی سے کلیجے میں لئے جاتا ہے ؎ ہم تری یاد سے غافل نہیں ہونے پاتے

جگر مرادآبادی نے کہا ہے کہ

جسے رونق ترے قدموں نے دے کر چھین لی رونق ⁂ وہ لاکھ آباد ہو اس گھر کی ویرانی نہیں جاتی

غرض کہ محبوب کی یاد و فراق سے متعلق اردو میں سینکڑوں خوبصورت اشعار موجود ہیں پھر بھی مولانا ماہر القادری رح نے اسی موضوع کو ہاتھ لگایا، اور کیسے سادہ و دلآویز پیرائے میں کہدیا کہ سه

ترے خیال نے بے چین کر دیا جس کو ⁂ کوئی خیال اسے مطمئن بنا نہ سکا

مولانا ماہر کی ایک غزل خاص شہرت رکھتی ہے۔ یہ غزل اگرچہ ان کے عہدِ شباب کی یادگار ہے لیکن آخری ایام میں بھی اُن سے اس غزل کی فرمائش کی جاتی تھی اور وہ اسے اپنے خاص انداز میں سنا کر مشاعرے کو لوٹ لیتے تھے۔ مجھے ان کی اس غزل کے چند اشعار زمانۂ طالب علمی سے یاد ہیں اور آپ کو بھی یاد ہوں گے پھر بھی سُنتے چلیے۔

پینے کی دیر ہے نہ پلانے کی دیر ہے ⁂ ساقی کے بس نگاہ اٹھانے کی دیر ہے

پروانے آہی جائیں گے کھینچ کر بہ جبرِ عشق ⁂ محفل میں صرف شمع جلانے کی دیر ہے

وہ بھی تڑپ نہ جائیں تو اس عاشقی پہ خاک ⁂ مجھ سے فقط نگاہ ملانے کی دیر ہے

جامِ شراب، مست گھٹا، مطرب و بہار ⁂ سب آچکے ہیں آپکے آنے کی دیر ہے

پوری غزل ایک موڈ کی ہے اور جذب وکیف میں ڈوبی ہوئی ہے، موضوع اور خیال کے اعتبار سے کوئی شعر اچھوتا نہیں ہے لیکن اسلوب و انداز کے لحاظ سے ہر شعر نیا ہے۔ ہر شعر کے موضوع سے قریب تر درجنوں اشعار اُردو شاعری میں موجود ہیں اور ایک سے ایک ہیں لیکن مولانا ماہر القادری کے اشعار کی بات ہی کچھ اور ہے۔ ان پر کسی سے استفادہ کا گمان ہوتا ہے نہ کسی سے توارُد کا بلکہ یوں لگتا ہے جیسے جذبات نے بے ساختہ اشعار کا روپ دھار لیا ہے اور ہر خیال خوشۂ انگور کے پکے دانے کی طرح، سطحِ ذہن سے الفاظ کے دامن پر ٹپک پڑا ہے۔

قطعہ

قسمت کیا ہر شخص کو قسّامِ ازل نے ⁂ جو شخص کہ جس کام کے قابل نظر آیا

بلبل کو دیا نالہ تو پروانے کو جلنا ⁂ غم ہم کو دیا، سب سے جو مشکل نظر آیا

ماہر القادری بحیثیت لغت شناس

(وارث سرہندی)

خدا بخشے ماہر القادری مرحوم بہت خوبیوں کے حامل تھے۔ وہ شاعر تھے، ادیب تھے، مدیر تھے۔ تبصرہ نگار تھے، خاکہ نگار تھے، مقرر تھے، عالم تھے اور بڑی حد تک باعمل بھی۔ حیرت کی بات نہیں ہے کہ ایسے جامع الصفات لوگ بھی پائے جاتے تھے، کیونکہ ہمارے اسلاف جامعیت کو پسند کرتے تھے، اس لئے کوشش کرتے تھے کہ زیادہ سے زیادہ علوم و فنون میں دستگاہ حاصل کی جائے۔ حیرت تو اس بات پر ہے کہ اب ایسے جامع الصفات لوگ پیدا نہیں ہوتے۔ شاید اس کی وجہ ہماری سہل انگاری اور اختصار پسندی ہے۔ ہر معاملہ میں اختصار اور تلخیص پر اتنا زور دیا جاتا ہے کہ اصل گم ہو کر رہ جاتی ہے۔ کیونکہ تفصیل کے علم کے بغیر تلخیص بے معنی اور بسا اوقات گمراہ کن ثابت ہوتی ہے۔ بہر حال اس اختصار پسندی نے ہمارے یہاں ہی نہیں بلکہ پوری دنیا میں تخصیص (Specialization) کو رواج دیا ہے۔ موجودہ دور دورِ تخصص ہے۔ میں اسے ادھورے پن کا دور کہتا ہوں۔ کیونکہ نام نہاد متخصصین کی معلومات عموماً ناقص اور ادھوری ہوتی ہیں۔ کوئی بھی فن یا شعبہ علم ہو وہ دوسرے فنون اور شعبہ ہائے علوم سے کٹا ہوا اور یکہ و تنہا نہیں ہوتا، بلکہ اس کا دوسرے شعبوں سے کم و بیش تعلق ضرور ہوتا ہے۔ اس لئے کسی شعبہ علم میں کمال حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اس سے متعلق دوسرے شعبوں اور اس سے ملتے جلتے فنون میں بھی مہارت حاصل کی جائے۔ ورنہ ادھورے پن کے سبب کسی بھی شعبہ میں کمال حاصل نہیں ہو سکتا۔ مگر اب نقطۂ نظر تبدیل ہو گیا ہے اور اختصار پسندی کا رجحان زور پر ہے۔ ہر شخص یہی چاہتا ہے کہ مختصر راستہ تلاش کر کے بعجلت تمام منزلِ مقصود تک پہنچ جائے۔ چنانچہ اس دور کے اہل تخصص دوسرے متعلقہ شعبہ ہائے علوم و فنون سے صرفِ نظر کر کے کسی ایک فن یا شعبہ میں مہارت کے جھنڈے گاڑنا چاہتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس اختصار پسندی کے سبب بسا اوقات مضحکہ خیز صورت پیدا ہو جاتی ہے اور نام نہاد مہارت مغالطہ انگیز اور گمراہ کن ثابت ہوتی ہے۔ اس طرح وہ خود بھی بھٹک جاتے ہیں اور دوسرے لوگوں کو بھی بھٹکا دیتے ہیں۔ مگر ماہر القادری مرحوم نہ تو بزعم خود کسی فن یا شعبہ کے متخصص تھے اور نہ اختصار پسند۔ انہوں نے اسلاف کا طریق عمل اختیار کر کے جامعیت پیدا کرنے کی کوشش کی اور اس میں کامیاب رہے۔ اگرچہ اس عمل میں سفر طویل ہو جاتا ہے اور محنت زیادہ کرنی پڑتی ہے، مگر اس طرح راستہ کے نشیب و فراز سے پوری آگاہی حاصل ہوتی ہے اور رسم و راہ منزل کا کوئی گوشہ آنکھ سے اوجھل نہیں رہتا۔

ایک شاعر اور ادیب کا زباندان ہونا تو بہرحال ضروری ہے، کیونکہ اس کے بغیر بات نہیں بنتی۔ خیالات کتنے ہی اعلیٰ و ارفع اور جدید و نادر ہوں، اگر اظہار ناقص ہو تو نہ ان کا صحیح طور پر ابلاغ ہو سکتا ہے اور نہ ہی ان میں اثر پیدا ہو سکتا ہے۔ ادب کا اظہار زبان ہی سے ہو سکتا ہے اور زبان مجموعہ ہے الفاظ کا، چنانچہ ایک شاعر اور ادیب کے لئے یہ لازمی ہے کہ وہ زبان پر عبور رکھتا ہو اور الفاظ کے تمام معنوی پہلوؤں، مآخذ اور ان کے باہمی تعلق اور مترادفات کے نازک فرق سے کماحقہٗ واقف ہو۔ چنانچہ تاریخ ادب گواہ ہے کہ دنیا میں عظمت کا تاج ان ہی اُدبا و شعرا کے سروں پر سجا ہے، جو زبان و بیان پر قدرت رکھتے تھے اور الفاظ کے بطون اور بیان کے پیچ و خم سے پوری طرح باخبر تھے۔ مگر فی زمانہ یہ نکتہ فراموش کر دیا گیا ہے۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ شعرا اور اُدبا کے ہجوم میں معدودے چند ایسے ہیں جو بات کہنے کا سلیقہ جانتے ہیں۔

ماہر القادری ایک ایسے ہی صاحب قلم تھے، جن کو الفاظ کے استعمال کا سلیقہ آتا تھا۔ یہ سلیقہ ان کو یوں ہی حاصل نہیں ہو گیا تھا، اس کے لئے انہوں نے بہت محنت کی تھی۔ مجھے ذاتی طور پر معلوم ہے کہ ایک ایک لفظ کی تحقیق اور محل استعمال معلوم کرنے کے لئے اتنی کاوش کرتے تھے کہ عام آدمی اس کے تصور سے بھی گھبرا جاتا ہے۔ پہلے وہ کسی لفظ کی تحقیق میں اپنے پاس موجود کتب لغت سے مدد لیتے تھے، اگر تشفی نہ ہوتی تو مقامی اہل علم و زبان سے خود مل کر یا فون کر کے اور بیرونی اصحاب کو خطوط لکھ کر اپنا مسئلہ پیش کرتے اور اس کا حل تلاش کرتے۔ بسا اوقات ان کے سوالات اور ان کے جوابات پر ان کے اعتراضات اتنے پر محل ہوتے اور موصوف ایسے ایسے نکتے پیدا کرتے کہ مجیب بغلیں جھانکنے لگتا۔ بعض اوقات یہ بحث اتنی طویل ہو جاتی کہ ہفتوں بلکہ مہینوں تک چلتی رہتی۔ خود مجھے اس کا تجربہ ہوا ہے۔ بعض لسانی مسائل پر ان سے مدتوں بحث چلتی رہتی اور میں اکتا جاتا۔ مگر وہ کبھی اکتاہٹ محسوس نہیں کرتے تھے، بلکہ ہر بار ان کا دم خم پہلے سے زیادہ ہوتا۔ الفاظ کے صحیح استعمال کا تو ان کو جنون تھا۔ کسی نے غلط لفظ استعمال کیا اور انہوں نے فوراً گرفت کی۔ اس معاملہ میں وہ کسی رعایت اور مروت کے قائل نہ تھے۔ جن لوگوں نے ان کے تبصرے غور سے پڑھے ہیں ان کو یاد ہوگا کہ وہ اپنے تبصرہ میں زبان و بیان کی غلطیوں کی نشان دہی ضرور کرتے تھے۔

تحقیق الفاظ کے اسی شوق فراواں نے ان کو لغت شناس بنا دیا تھا۔ ترقی اردو بورڈ (موجودہ نام اردو لغت بورڈ) کی زیر ترتیب اردو کی جامع لغت میں ان کو گہری دلچسپی تھی۔ کیونکہ کسی زبان کے لئے کسی جامع اور مستند لغت کی جو اہمیت ہو سکتی ہے اس سے وہ پوری طرح واقف تھے۔ اُس زمانہ میں بورڈ کا ایک سہ ماہی مجلّہ "اردو نامہ" شائع ہوتا تھا، جس میں اس لغت کے اجزاء مسلسل شائع ہوتے تھے، تاکہ اہل علم و لسان ان پر اپنی رائے ظاہر کر سکیں اور اس طرح لغت کی خامیاں دور ہو سکیں۔ ان اجزاء پر "اردو نامہ" کے اوراق میں ان کے تبصرے مکاتیب کی صورت میں محفوظ ہیں۔ ان مکتوبات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ لسانی امور میں ان کی نظر کتنی گہری اور

دقیقہ رس تھی۔ لغت کے سلسلہ میں بورڈ کے جو علمی اجلاس ہوتے تھے، ان میں بھی وہ اکثر شرکت کرتے اور اپنا نقطۂ نظر پیش کرتے۔

اگرچہ لغت ولسانیات سے مجھے پہلے بھی دلچسپی تھی، مگر ماہر مرحوم نے میری اس دلچسپی کو عملی رنگ میں ظاہر کرنے پر مجبور کیا۔ وہ تقاضے کرکے بورڈ کی لغت پر مجھ سے تبصرے اور مضامین لکھواتے اور ان کی داد دے کر میری ہمت افزائی کرتے۔ ان کی یہ کوشش بھی رہی کہ میں بورڈ میں مدیر لغت کی حیثیت سے شامل ہو جاؤں۔ اس کیلئے انہوں نے کوشش کرکے راہ ہموار کی اور بورڈ کی طرف سے اس عہدہ کی مجھے پیش کش بھی ان کی مساعی کے طفیل ہوئی۔ مگر میں بوجوہ اس پیش کش کو قبول نہ کرسکا، جس کا ان کو مدت العمر افسوس رہا۔ لیکن وہ میرے حالات سے باخبر تھے، اس لئے مجھے مجبور بھی نہیں کیا۔ ان ہی کی ترغیب وتشویق کے سبب میں اپنی ناچیز تالیف علمی اردو لغت مکمل کرسکا۔ جب یہ کتاب شائع ہوکر ان کی خدمت میں پہنچی تو بہت خوش ہوئے۔ ان کی دلچسپی اور دوست نوازی کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ جو اہلِ علم ان سے ملاقات کے لئے آتے ان کو یہ کتاب دکھاتے۔ حتیٰ کہ بعض اہلِ علم کے پاس خود یہ کتاب لے کر گئے لیکن وہ کسی بھی معاملہ میں اندھی محبت کے قائل نہ تھے۔ خوبیوں کے ساتھ خامیوں پر بھی ان کی نظر ہوتی تھی۔ اگر وہ خوبیوں کی دل کھول کر تعریف کرتے تو خامیوں پر گرفت بھی ضرور کرتے۔ میری اس لغت کی انہوں نے اتنی تعریف کی کہ بعض اوقات مجھے شرمندگی کا احساس ہونے لگتا۔ لیکن بایں ہمہ اس لغت میں جو خامیاں اور کوتاہیاں رہ گئی تھیں ان کو بھی موصوف نے نظر انداز نہیں کیا۔ اس سلسلہ میں انہوں نے مجھے بہت طویل خطوط لکھے۔ جن میں میری اس تالیف کے کمزور پہلوؤں پر بحث کی گئی تھی۔ میں نے ان کے جواب بھی دئیے۔ اس غیر مختتم سوال وجواب کے سلسلہ سے میری مصروفیات میں خلل پڑنے لگا تو میں نے تجویز پیش کی کہ وہ میری کتاب کا بالاستیعاب مطالعہ فرمائیں اور ان کو جو غلطی یا خامی نظر آئے اسے یاداشت کی صورت میں قلم بند کرتے رہیں۔ جب مطالعہ مکمل ہو جائے تو اغلاط کی فہرست مجھے بھیج دیں۔ پھر ان پر تفصیلی بحث کے بعد جو خامیاں ثابت ہوں۔ ان کی اصلاح کتاب کے آئندہ ایڈیشن میں کردی جائے۔ چنانچہ میری تجویز کو انہوں نے قبول کیا اور یہ کام شروع کردیا۔ لیکن موت نے ان کو مہلت نہ دی کہ وہ اسے مکمل کرسکتے۔ بدقسمتی سے اس ضمن میں جو یاد داشت انہوں نے مرتب کی تھی وہ بھی نہ مل سکی۔ ان کی وفات کے بعد میں نے ان کے برادر اصغر مسرور حسین صاحب سے التماس کی تھی کہ وہ یہ یاد داشت تلاش کرکے مجھے بھیج دیں۔ مگر ان کو نہیں ملی۔ اگر وہ مل جاتی تو میرا بوجھ ہلکا ہو جاتا بہرحال میں نے از خود ان خامیوں کو تلاش کرکے ان کی اصلاح کی کوشش کی۔ اس کا ذکر میں نے اس لئے نہیں کیا کہ اس میں میری ستائش کا پہلو نکلتا ہے۔ بلکہ یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ ان کو لسانی مسائل سے کتنی گہری دلچسپی تھی۔

کوئی بھی معاملہ ہو ان کا ذوق بہت لطیف تھا۔ خوراک، لباس، تحریر، تقریر غرض ہر شعبہ میں ان کے ذوق کی لطافت کا اظہار ہوتا تھا۔ پھر الفاظ کے ضمن میں اس لطافتِ ذوق کا اظہار کیوں نہ ہوتا۔ اسی لطافتِ ذوق کے باعث

وہ بعض الفاظ کے استعمال کو مکروہ سمجھتے تھے۔ مثلاً انگریزی لفظ material کا ترجمہ اردو میں "مواد" کیا جاتا ہے۔ "مواد" اردو میں "پیپ" کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ ان کا ذوقِ لطیف یہ گوارا نہیں کر سکتا تھا کہ لکھنے پڑھنے کی چیزوں کے لئے یہ لفظ استعمال ہو۔ اس لئے وہ ان معنی میں "مواد" استعمال نہیں کرتے تھے۔ پہلے وہ اس کے لئے "مسالا" کا لفظ استعمال کرتے رہے۔ مگر اس سے ان کی تشفی نہ ہوئی تو اس کے لئے انہوں نے ایک نیا لفظ "لوازمہ" وضع کیا۔ چنانچہ خود بھی بالالتزام ان معنی میں "لوازمہ" استعمال کرنے لگے اور احباب کو بھی اس کے استعمال کی ترغیب دیتے۔ مجھے بھی اس سلسلہ میں کئی بار لکھا۔ لیکن میں ان کی تجویز قبول کرنے سے قاصر رہا، کیونکہ میرے نقطۂ نظر سے کسی زبان کا کوئی بھی لفظ نہ مکروہ ہوتا ہے اور نہ فحش۔ کراہت اور فحاشی اعتباری چیزیں ہیں۔ ذاتی نہیں۔ کسی چیز کو فحش یا مکروہ اس کا استعمال بناتا ہے۔ اگر اس کا استعمال قاعدہ و ضابطہ کے مطابق ہو تو اس میں کوئی کراہت نہیں ہوتی۔ اگر استعمال اصول و قواعد کے خلاف ہو تو وہی چیز مکروہ اور ناگوار ہو جاتی ہے۔ جنس (sex) ہی کو لے لیجئے۔ یہ زندگی کا بنیادی جزو ہے۔ مگر اس کا غلط اور خلافِ ضابطہ استعمال نہ صرف اسے فحاشی میں تبدیل کر دیتا ہے، بلکہ گمراہی اور فساد کا موجب بنتا ہے۔ یہی حال الفاظ کا ہے۔ الفاظ کی کراہت کا تعلق بھی ان کے استعمال سے ہے۔ خود اسلامی شریعت میں حلّت ذاتی ہے اور حرمت اضافی۔

اردو میں اور بھی متعدد الفاظ ایسے ہیں، جو متضاد معانی کے حامل ہیں۔ مثلاً "طہارت" کا لفظ ہے، اس کے معنی پاکیزگی ہیں، مگر اردو میں یہ استنجا کے معنی میں بھی مستعمل ہے۔ اسی طرح طہارت کا ترجمہ پاکی بھی اردو میں اپنے لغوی معنی کے علاوہ موئے زہار کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ اس کا محلِ استعمال خود ان کا مفہوم متعین کر دیتا ہے۔ اس حقیقت سے قطع نظر ماہر مرحوم کے نقطۂ نظر سے ان کے ذوق کی لطافت بہرحال ثابت ہوتی ہے۔

بعض اوقات تعجب ہوتا تھا کہ ایک طرف تو وہ صحت لفظی پر بہت زیادہ زور دیتے تھے اور دوسری طرف بعض غلط العام بلکہ غلط العوام الفاظ بلا تامل استعمال کرتے تھے اور ان کے استعمال پر مُصر تھے۔ مثلاً "مشکور" یعنی شکر گزار، تابعدار بمعنی تابع اور فوق البھڑک قسم کی تراکیب کو وہ جائز سمجھتے تھے۔ اس کی دلیل ان کے پاس یہی تھی کہ بعض اساتذہ اور اہلِ علم نے ان الفاظ کو استعمال کیا ہے اور زبان میں چلن ایک حجت ہے۔ اس معاملہ میں مجھے ہمیشہ ان سے اختلاف رہا۔ کیونکہ میں سمجھتا ہوں غلطی بہرحال غلطی ہے، خواہ اس کا مرتکب کوئی بھی ہو۔ اس لئے اس رجحان کی حوصلہ شکنی ضروری ہے۔ اگر استاد ناسخؔ اور ان کے متبعین ایسے الفاظ کو زبان سے خارج کر کے صحیح الفاظ کے استعمال کو رواج نہ دیتے اور محض اساتذہ اور متقدمین کے استعمال کو حرفِ آخر سمجھ لیتے تو آج ہماری زبان کہاں ہوتی؟ کیا یہ ایک عوامی بولی کی حدود سے ترقی کر کے علمی زبان کا درجہ حاصل کر سکتی تھی؟۔ زبان میں غلط العام کا بھی ایک مقام ہے۔ مگر غلط العام کا دائرہ اتنا وسیع نہیں ہونا چاہیئے کہ ہر غلط لفظ اور بھونڈی ترکیب اس میں شامل

ہو کر سندِ جواز بلکہ تمغائے فصاحت حاصل کر لے۔ صرف ان ہی الفاظ کو غلط العام سمجھنا چاہیئے۔ جن کے استعمال میں اہلِ زبان کا کوئی اختلاف نہ ہو اور زبان میں ان کا کوئی نعم البدل نہ ہو۔ مثلاً لفظ "غلطی" اس کے ثبوت میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ موجودہ صورت میں یہ غلط ہے اور اس میں "ی" زائد ہے۔ مگر اس کے استعمال پر کیا عوام اور کیا خواص سبھی کا اتفاق ہے اور پھر اس کا نعم البدل بھی اردو زبان میں موجود نہیں ہے۔ اس لئے اسے "غلط العام" میں شامل سمجھ کر جائز قرار دیا جائے گا۔ اگر کہا جائے کہ اس کا نعم البدل "غلط" موجود ہے۔ تو اس کے جواب میں عرض ہے کہ اردو میں "غلط" بھی مستعمل ہے۔ مگر اردو میں یہ بطور صفت استعمال ہوتا ہے اور ایسی صورت میں یہ ضروری تھا کہ اس کا اسم کیفیت حسب قاعدہ یائے مصدری کے اضافے سے بنایا جاتا، چنانچہ "غلطی" بنایا گیا۔ یہ اردو کا تصرف ہے اور ایسے تصرفات سے کوئی زبان بھی خالی نہیں ہے۔ مگر تصرفات کی بھی ایک حد ہوتی ہے اور ایک ضابطہ اور قرینہ بھی۔ یہ نہیں کہ ہر لفظ میں خواہ مخواہ تصرف کیا جائے۔ جہاں تک ممکن ہو، دوسری زبانوں کے الفاظ کو ان کی اصلی صورت اور معنی میں استعمال کیا جائے۔ صرف وہی تصرفات قبول کئے جائیں جو ناگزیر اور خوشگوار ہوں۔ اردو میں بعض الفاظ اور تراکیب ایسی ہیں جو گھٹیا مزاح پیدا کرنے کے لئے بعض مسخروں کی وضع کردہ ہیں۔ مزاحیہ رنگ میں تو یہ تراکیب ایک حد تک گوارا ہیں اور لطف بھی دیتی ہیں۔ مگر ان کو مستقل حیثیت دینا درست نہیں ہے۔ "فوق البھڑک" بھی اسی قسم کی ترکیب ہے۔

بہرحال یہ بھی ایک نقطۂ نظر ہے۔ اگر کوئی شخص دوسرے نقطۂ نظر کو ترجیح دیتا ہے تو اسے مطعون نہیں کیا جا سکتا چنانچہ ماہرؔ مرحوم اگر ایسے الفاظ و تراکیب کو جائز سمجھتے تھے، تو ان سے اختلاف تو کیا جا سکتا ہے، مگر ان کو طعن و تعریض کا ہدف نہیں بنایا جا سکتا اور نہ اس سے ان کی لغت شناسی پر کوئی حرف آتا ہے۔ ان میں اور عام لوگوں میں اس معاملہ میں واضح فرق یہ تھا کہ وہ حقیقت سے باخبر تھے اور ایک نقطۂ نظر کے تحت ان کو جائز سمجھ کر استعمال کرتے تھے۔ مگر عام لوگوں کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ حقیقت کیا ہے۔ اور قاعدہ کے مطابق کیا صحیح ہے اور کیا غلط۔ مگر ماہرؔ مرحوم الفاظ کی حقیقت سے پوری طرح باخبر تھے۔ جو اُن کی لغت شناسی کی دلیل ہے۔

سب سے بڑی بات یہ کہ وہ اپنے نقطۂ نظر پر کاربند و پابند ہوتے ہوئے بھی اختلاف کو برداشت کرنے کا ظرف رکھتے تھے اور علمی اختلاف کو ذاتی تعلقات میں حائل نہیں ہونے دیتے تھے۔ میرا ان سے بعض امور میں شدید اختلاف بھی رہا، لیکن ذاتی تعلقات ہمیشہ خوشگوار رہے۔ نہ میں نے ان کے احترام میں کبھی کمی کی اور نہ انہوں نے میری قدردانی میں کوتاہی کی۔ اب ایسا جامع الصفات دوست نواز اور حق پسند انسان کہاں ملے گا۔ ؎

وہ صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں ٭ اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں۔

غزل

راسخ عرفانی

دھواں دھواں ہیں دریچے، دیار و در سُونے ؛ تلاشِ رزق میں کیا کیا ہوئے ہیں گھر سُونے
ہوائے تند میں جانے کدھر گئیں چڑیاں ؛ فراق رُت نے کئے ہیں سبھی شجر سُونے
ہجومِ خلق میں شہروں کے راستے گم ہیں ؛ پڑے ہیں گاؤں کے منظر ڈگر ڈگر سُونے
میں کس سے اُجڑے نگر میں ترا پتا پوچھوں ؛ سبھی مکاں ہیں سرِ جادۂ سفر سُونے

بچھے ہیں اپنے مکینوں کی راہ میں اب تک
فیصل شہر سے باہر کئی کھنڈر سُونے

کھنڈر تو سُونے ہوتے ہیں۔

غزل

شوق ماہری (بھارت)

گر دل کو ترا عشق میسّر نہیں ہوگا ؛ یہ گوشۂ تاریک منوّر نہیں ہوگا
سر اپنا بصد ناز اٹھاتا رہے لیکن ؛ شمشاد ترے قد کے برابر نہیں ہوگا
جب تک نہ جلا لے گی نشیمن کے خس و خار ؛ بجلی کو کبھی چین میسّر نہیں ہوگا
جس پر نہیں ہونگی مرے احباب کی مُہریں ؛ لوگو! وہ مرے قتل کا محضر نہیں ہوگا
ہر روز نیا زخم نئے طرزِ تغافل ؛ ایسا تو کسی کا بھی مقدّر نہیں ہوگا
دامن ہی دریدہ ہے کسی کا نہ گریباں ؛ اس شہر میں شاید کوئی کافر نہیں ہوگا

اے شوق دُعاؤں میں اثر آیا نہ آئے
اشکوں سے جو دامان تر نہیں ہوگا

ماہر کی فکر کے نفسیاتی پہلو

نثار زبیری

شاعری کا تو نہیں، ماہرانہ شاعری کا شعار یہ ہے کہ وہ اچھے موسم کی طرح ہوتی ہے جس کا اثر فوری، ہمہ گیر اور
ع ہوتا ہے۔ اس کی تشریح کی تو جاتی ہے لیکن درحقیقت وہ تشریح یا تعریف کی محتاج نہیں ہوتی۔ وہ شاعر کو
ۂ اظہار اور سننے اور پڑھنے والوں کو سرور و شعور عطا کرتی ہے۔ یہ عمل بجلی کی طرح تیز رفتار نہ سہی لیکن بجلی ہی کی
قوی اور نتیجہ خیز ہوتا ہے۔ برقی رو نظر نہیں آتی لیکن بڑی بڑی قوی ہیکل مشینوں کو حرکت آشنا کر دیتی ہے۔ شاعری بھی
ق گرماتی۔ دھیمی بجلی کا دوسرا نام ہے۔

ماہر القادری کی پہچان اُن کی شاعری ہے۔ وہ نقاد تھے، ادیب تھے، زندگی میں ایک مختصر عرصے کے لئے
ن بھی رہے۔ لیکن دراصل یہ اُن کی شاعری ہے جس نے انہیں برگد کا چھتنار درخت بنایا ہے۔ شعر گوئی ان کیلئے
ی طرح فیصلہ کن تھی۔ اسی سے انہوں نے شہرت دوام پائی اور وہی ان کی دوسری صفات کو اُجاگر کرنے کا باعث
۔ شاعری سے اُن کی اِس نسبت کے پیشِ نظر اُن کی فکر کو سمجھنے کے لئے اُن کے اشعار کا آئینہ خانہ۔ سب سے اہم
بھا ہے اور شاید وہ کرن بھی جو سورج تک پہنچانے کا ذریعہ بن سکتی ہے۔

فکر ماہر کے نفسیاتی گوشوں کو سمجھنے کے لئے ہماری بنیادی ضرورت یہ ہے کہ پہلے ہم شاعری کی نفسیاتی توضیحات
بہ مرکوز کریں۔ شاعری کو وجدان کا کرشمہ اور ترفّع (سبلی میشن) کی ایک شکل قرار دیا گیا ہے۔ ترفع لیا ایک ایسا
ہے جو کسی خوبی یا جوہر یا احساس کو بلندی کی نت نئی راہوں پر ڈال دیتا ہے اور اُس کی سادگی کو پُرکاری کی بہار
شنا کر دیتا ہے۔ ماہرینِ نفسیات نے ترفّع کو تمام فنونِ لطیفہ کا سبب قرار دیا ہے۔

شاعری کا خمیر۔ لطیف ترین حسّیات سے اُٹھتا ہے۔ اچھا شاعر۔ احساس، ادراک، دانش اور اظہار کی قوّت
رعہ ہوتا ہے۔ اس کی آنکھوں کے پیچھے مزید آنکھیں، دل کے پیچھے مزید دل اور ذہن کے پیچھے مزید ذہن چھُپے
تے ہیں۔ وہ صرف دیکھتا نہیں، صرف محسوس کرتا اور سوچتا نہیں بلکہ احساس و ادراک کو اپنی دانش سے ارتفاع
ے کر جمالی اظہار سے اجالتا ہے اور خوشبو کو آنکھوں سے دِکھا دیتا ہے۔

اس طرح دیکھئے تو شاعری۔ دراصل ذات کے اندر برپا ہونے والی خوشگوار و ناخوشگوار قیامتوں کو قبولیت

عام کا ایسا لباس عطا کرنے کا نام ہے جو خوبصورتی کے ہر متلاشی کو پسند آتا ہے۔ کچھ لوگ اِسے اپنی ذہنی ضروریات کی پیمائش پر پورا اترنے کی وجہ سے پسند کرتے ہیں اور کچھ —— اس کی رنگا رنگی، اِس کی بُنت اور اسے تیار کرنے والے کی مہارت پر مر مِٹتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ جو اشعار پڑھنے اور سننے والے کے ذہنی تجربے سے بعید ہوتے ہیں — وہ بھی بعض اوقات اپنی ہمہ گیر صداقت، اور جمالِ اظہار کی حیرت انگیز بوقلمونی کی وجہ سے پسند کئے جاتے ہیں

شاعری اور نفسیات کا یہ رشتہ اخلاقی اور اتنا توانا ہے کہ شاعری درحقیقت — شاعر کی نفسیات کا ایک آئینہ قرار پاتی ہے۔ اِس آئینے میں شاعر کے انفرادی جوہر اور کرب، اس کے ماحول کی روشنیاں اور تیرگیاں، اس کے احساس کے لطیف اور سوہانِ روح منظر، اس کے ادراک میں جاگنے اور سر اُبھارنے والے سوال، اس کی دانش کے فراہم کردہ جواب اور جوابی سوال اور اُس کے اظہار کی قوت کے دل و نظر میں اتر جانے والے رنگ صاف نظر آتے ہیں۔

شاعر اور عام آدمی کا فرق یہ ہے کہ — شاعر کی نفسیات اُسے ایک ایسے لہجے میں بولنے کی ترغیب دیتی ہے جو قیدِ زمان و مکاں سے بھی آزاد ہوتا ہے اور قیدِ اداکاری سے بھی۔ وہ بظاہر ایک عام آدمی کی طرح کوئی سماجی تبصرہ کر رہا ہوتا ہے — لیکن —— احساس ادراک اور وجدان کو کچھ اِس طرح ہم آہنگ کر لیتا ہے کہ اُس کی آواز آنے والے وقتوں کے لئے فضا پر محیط ہو جاتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ میرؔ اور غالبؔ کی آواز آج بھی صاف سنائی دیتی ہے۔ اُن کے دور میں نہ جانے کتنے افراد نے دقیع سماجی تبصرے کئے ہوں گے — لیکن احساس و ادراک کو وجدان سے مربوط کرنے کا جو فن میرؔ اور غالبؔ کے حصہ میں آیا تھا اس نے انہیں لافانی بنا دیا ہے۔

یوں تو ہر شاعر کی فکر اس کے احساس کی شدت اور وجدان کے معیار سے عبارت ہوتی ہے — لیکن ہر شاعر لافانی نہیں ہوتا — لافانی شاعر کے لئے، دوسری ضرورتوں کے علاوہ، ایک ضرورت یہ بھی ہے اُس کے اپنے اندر دل و نظر کو مسخر کرنے کی قوت موجود ہو۔ یہ خوبی ایسی فکر کے بغیر پیدا نہیں ہو سکتی جس میں احساس کی شدت کے ساتھ گہرائی و گیرائی، اپنے ماحول کی تلخ و شیریں صداقتوں اور ہر دور میں زندہ رہنے والی سچائیوں پر بھرپور تبصرہ اور ہزارہا کانٹوں کے درمیان کھِلنے والے تنہائیوں کی طرح امید کی جوت جلانے کا کرشمہ موجود نہ ہو۔

لافانی شاعری کی اِس عمومی غیر روایتی اور غیر سکہ بند قسم کی تعریف کے بعد — اب آیئے فکرِ ماہر القادری کی طرف
ہر انسان کی طرح منظور حسین کے ذہنی کمپیوٹر کو ان کے منفرد معاشرتی حالات نے وہ غذا فراہم کی جو اُن کی منفرد فکر کا باعث بنی — اس منفرد فکر کو بہت سے لوگ عمومی انداز میں برت کر زندگی گذار دیتے ہیں۔ لیکن ماہر القادری

ایک پیدائشی شاعر تھے اسی لئے انہیں اللہ نے احساس اور ادراک کے ساتھ ساتھ وجدان اور قدرت اظہار کی خصوصی صفات سے بھی نوازا تھا ۔ للہذا ماہر القادری اپنی منفرد فکر کو ۔ عمومی بن جانے سے بچانے میں کامیاب ہو گئے ۔

ان کی فکر کے چار بنیادی پہلو دینداری ، رومانویت ، مسلسل مشاہدے کا عمل اور حقیقت پسندی نظر آتے ہیں

دین ۔ اس ماحول کا اہم ترین صورت گر عامل تھا جس میں ماہر القادری نے آنکھ کھولی ۔ لیکن وہ صرف پیدائشی مسلمان نہیں تھے نہ وہ اسلام کو صرف رسوم ورواج کا مجموعہ ماننے پر تیار تھے ۔

اپنی فکر کی اس جولانگاہ میں وہ حکیم الامت علامہ اقبال کے مقلد ہیں اور اس دنیا کے خواب دیکھتے ہیں جس میں اسلام ایک بڑی قوت ہوگا ۔ وہ کہتے ہیں ۔ ؎

امیروں کی ضرورت ہے نہ سلطاں کی ضرورت ہے   زمانے کو فقط مرد مسلماں کی ضرورت ہے

وہ لاکھ روٹھیں ، ہزار روٹھیں ، غضب میں آئیں کہ تلملائیں

خدا کی اس پاک سرزمیں پر خدا کا قانون ہی چلے گا

اس زہد پہ افسوس ، نہ ہو جس میں عزیمت   وہ دستِ دعا ہائے جو بے تیر و کماں ہے

خالق کا گواہ خود ہے دنیا کا وجود

آیت ہے خدا کی عالم ہست و بود

سائنس کی سعی ، بے نہایت کی قسم

ایمان نہیں تو علم و دانش بے سود

ماہر القادری کی فکر کا یہ پہلو دین کی اس نفسیاتی توجیہ کا آئینہ دار ہے جس کے مطابق ایک سچا دین ہر انسان کی اوّلین ضرورت اور انسانی معاشرے کی ترتیب وتنظیم ، ترقی اور مستقبل کی بہتری کا سبب و ذریعہ ہے ۔ انہوں نے بھی اپنے مطالعے اور مشاہدے اور خصوصاً یورپ کے مشاہدے سے اس راز کو پا لیا تھا کہ مغرب اور ابلیس کی نظر میں

مزدکیت فتنہ فردا نہیں ، اسلام ہے ۔

اس راز کی رہنمائی کو ان کے فن شعر گوئی نے جس انداز میں قبول کیا اس کا سب سے بڑا ثبوت ان کی نعتیں ہیں ۔ جن میں والہانہ جذبات کا سمندر رواں ہے ۔ ماہر القادری کا لافانی سلام اور عقیدت میں ڈوبی ہوئی نعتیں ، سلام ونعت برائے سلام ونعت کا مظہر نہیں بلکہ اس تبدیلی کے لئے ایک ذریعہ ہیں جس کی آرزو ماہر القادری کی روح میں رچ بس گئی تھی ۔ بہتر مستقبل تو ہم سبھی چاہتے ہیں لیکن سارے عالم انسانی کے لئے بہتر مستقبل کی آرزو ، اس کے لئے کوشش اور جستجو

ایسی فکر کی علامت ہے جس کا محور صرف اپنی ذات یا صرف اپنا ماحول نہیں ہوتا۔ اس کوشش میں شاعر بہتر مستقبل کی انفرادی ضرورت کو اقصائے عالم کے ہر فرد کی ضرورت تک وسیع کر کے اِس امر کا واضح ثبوت پیش کرتا ہے کہ اسلام ایک مختلف آفاقیت کا درس دیتا ہے جو تمام تر مثبت ہے اور روح سے خالی نہیں۔

ماہر القادری کی یہ دینداری، دینی آفاقیت اور صحیح معنوں میں بہتر مستقبل کی آرزو ۔ انسانی نفسیات کی ایک بنیادی ضرورت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ تحفظ (سکیورٹی) ہر انسان اور ہر قوم کو درکار ہے۔ بعض لوگ اسے ہتھیاروں سے حاصل کرنا چاہتے ہیں اور بعض پختہ مکانات سے۔ لیکن ماہر القادری کا شمار ان گنے چنے افراد میں ہے جو مثبت افکار سے ایک ایسی محفوظ دنیا مرتب کرنا چاہتے ہیں جس میں انہیں بھی تحفظ مل سکے اور انسانی نوع کو بھی۔

ماہر القادری کی فکر کا یہ گوشہ انہیں عمومیت کی صف سے نکال کر اُس زینے پر لا کھڑا کرتا ہے جہاں وہ ممتاز و سر کشیدہ نظر آتے ہیں۔

ان کی فکر کا دوسرا اہم پہلو وہ شدید رومانویت ہے جو ان کی غزلوں اور "جمنا کا کنارا" جیسی نظموں کی جان ہے۔ اور جس کے لئے عہدِ شباب بنیادی ضرورت نہیں۔ ماہر القادری نے اپنے کلام کی تاریخ وار ترتیب میں یہ بات واضح کر دی ہے کہ انہوں نے رومانویت میں ڈوبی ہوئی غزلیں ہر دور میں کہی ہیں۔ فرائیڈ اس جذبہ کو جہدِ لقا سے متعلق قرار دیتا ہے جبکہ نفسیات کے میدان میں تازہ ترین تحقیق اس رخ پر جا رہی ہے۔ جہاں الفاظ اور ابلاغ کی صورتوں کو ذہن کے مطالعہ کا ذریعہ بنایا جا رہا ہے۔ نفسیاتی تحقیق کے اس رخ کے پیشِ نظر خوبصورت چہروں کا خوبصورت بیان اور جمال کو پسند کرنے کی خدائی صفت الوہی ایک خوبصورت ذہن کی عکاسی کرتے ہیں۔

حسن والوں تمہاری بھی کیا بات ہے	؎	ہر ملاقات پہلی ملاقات ہے
جامِ شراب، مست گھٹا، مطرب و بہار	؎	سب آ چکے ہیں آپ کے آنے کی دیر ہے
میری قسمت سے توجہ پر جو مائل ہو گئیں	؎	وہ نگاہیں اور قاتل ہو گئیں
نکھرا ہوا ماحول یہ گلرنگ فضائیں	؎	شاید ترے عارض کی کہیں چھوٹ پڑی ہے
چلے دو قدم اور قیامت اُٹھا دی	؎	ذرا ہنس دیئے اور بجلی گرا دی

ماہر القادری کی یہ جمالیاتی شاعری ــ صرف جمالیاتی شاعری نہیں؛ اس طرح کے اشعار میں وہ جمال کا تذکرہ اپنے جمالِ ذہنی کے ساتھ کرتے نظر آتے ہیں اور ان کے جمالِ ذہنی ــ میں دوسری خوبیوں کے علاوہ ذہنی پاکیزگی کی جھلک ہر جگہ نمایاں ہے اس پاکیزگی کی بدولت وہ ہر ایک پری جمالی نظارے کو صرف بیان نہیں کرتے بلکہ اس سے متعلق اپنا عمرانی تبصرہ بھی بڑی

خوبصورتی کے ساتھ شامل کر کے اپنا وزن معصومیت، پاکیزگی اور خوش اطواری کے پلڑے میں ڈال دیتے ہیں۔

یہاں کیا ذکر شرم و آبرو کا ⁂ یہ دورِ عظمتِ مریم نہیں ہے

نقاب اٹھتے ہی بیگانہ ہو گئیں نظریں ⁂ مری نگاہ نے جلووں سے انتقام لیا

بہر شکل جلوہ طلب ہو گئی ہے ⁂ نظر کس قدر بے ادب ہو گئی ہے

عصمت پاکبازی سے روشن جبیں ⁂ حسن عزت سے رخسار تابندہ تر

رومانویت کا یہ ایک خصوصی انداز ـــ ماہر القادری کے تصورِ دین سے گہرا ربط رکھتا ہے اور رومانویت برائے تلذذ سے بالکل مختلف اور بیگانہ ہے۔

ماہر مرحوم کی فکر کا تیسرا گوشہ گہرے مشاہدے کی عادت کا غماز ہے۔ مشاہدہ ہم سب کرتے رہتے ہیں لیکن ایسا مشاہدہ جو ادراک کا جزو بن کر اظہار کی تمام ترقوت کے ساتھ سامنے آئے ـــ قدرے مختلف نوعیت کی چیز ہے۔ اس کے لئے احساس کی شدت کے ساتھ سوچنے اور تجزیہ کرنے کے مسلسل عمل کی.... ضرورت ہوتی ہے۔

ابتدائی دور میں ان کا مشاہدہ ابتدائی اور وقتی معاملات سے متعلق ہے مثلاً ؎

وہ دمِ رخصت رُخِ گلرنگ افسردہ مگر ⁂ مسکرا دینے کی کوشش کی گئی میرے لئے

لیکن آخر آخر اس میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔

پھولوں کی ذرا روش تو دیکھو ⁂ کانٹوں سے نباہ کر لیا ہے

جنوں کے آثار ہیں نمایاں بہار کا آ گیا زمانہ ⁂ خرد سے تم مشورہ نہ کرنا تراش دے گی کوئی بہانہ

مجھے فریب نہ دے اے نشاطِ میخانہ ⁂ میں سن رہا ہوں صدائے شکستِ پیمانہ

بے اثر ہیں سینکڑوں نغمے نہ ہو گردشِ سفر ⁂ ایک نالے سے بدل جاتا ہے رنگِ انجمن

نظارہ گر نصیب نہیں ہے نہیں سہی ⁂ یہ بھی بہت ہے دید کی حسرت نظر میں ہے

لطافتِ نگہ ملتفت کا کیا کہنا ⁂ کبھی کبھی تو یہ محسوس بھی نہیں ہوتی

عشق ایسے بھی مراحل سے گذرتا ہے جہاں ⁂ حسن کو بھی نظر انداز کیا جاتا ہے

ذہن ہو دل ہو یا ضمیر و نگاہ دل میں سوز ⁂ کوئی آئینہ بے غبار نہیں

اظہار میں مشاہدے کی یہ اثر آفرینی — ایک جامع شخصیت کی نشاندہی کرتی ہے۔ نفسیات میں شخصیت کے مطالعہ کو اسی لئے بڑی اہمیت حاصل ہے کہ اس سے داخلی خلا (Inner self) کی گتھیاں سلجھانے میں مدد ملتی ہے — ماہر القادری اپنی شاعری کی روشنی میں ایک مکمل شخصیت اس طرح قرار پاتے ہیں کہ وہ اپنے مشاہدے کی ساخت اور احساس کی لطافتوں کو صرف بیان نہیں کرتے بلکہ اس سے ایک روشن مستقبل تک راستہ بنانے کی جدوجہد کرتے ہیں اور دوسروں کو اس کی ترغیب دیتے ہیں۔

ماہر مرحوم کی فکر کا چوتھا اہم پہلو ان کی غیر معمولی حقیقت پسندی ہے۔

پروانہ ہے خود اپنی جگہ شعلۂ بے تاب
اور شمع کا یہ حال، جلایا تو جلی ہے

ترا کام زہد و تقویٰ، مرا کام جذب و مستی
تو فقط رکوع و سجدہ، میں تمام ترنمازی

ہو روس کی تہذیب کہ لندن کا تمدن
یہ فتنۂ نمرود ہے وہ مکر عزازیل

حقیقت پسندی بلکہ حقیقت پرستی بھی ایک مکمل اور خود پر اعتماد رکھنے والی شخصیت کا خاصہ ہوتا ہے۔ خود پر اعتماد رکھنے والا فرد ہی اپنے مشاہدے کی ندرت اور حقیقت پرستی کی عادت کو علی الاعلان سب کے سامنے پیش کرسکتا ہے اور لوگوں کے ردعمل کا مقابلہ کرسکتا ہے۔ صحیح معنوں میں حقیقت پرست انسان وہ ہوتا ہے جو اپنے احساس کی تہذیب کرکے پہلے اپنے اندرون کو حقیقت جھیلنے کے لئے تیار کرتا ہے۔

بظاہر کسی شاعر کو حقیقت پسندی کی خلعت عطا کرنا مشکل ہوتا ہے جہاں بات صرف شاعری کی نہ ہو وہاں تو حقیقت کی کارفرمائی بہت نمایاں ہوکر سامنے آسکتی ہے۔ ماہر القادری کی شعرگوئی — شعرگوئی تو ہے لیکن وہ صرف شعرگوئی نہیں ہے اس میں عمرانی تبصرے اور حقیقت پرستی کے وہ انداز موجود ہیں جو کم شعرا میں پائے جاتے ہیں۔

ماہر القادری کی شاعری کے یہ چاروں پہلو جن کا اوپر ذکر کیا گیا اور ان کی نفسیاتی توضیح دراصل ان کی فکر کو سمجھنے کی ایک ابتدائی اور پہلی کوشش ہے۔ ماہر مرحوم — دوسرے زاویوں کے علاوہ اس زاویے سے بھی ایک بڑے شاعر نظر آتے ہیں کہ اُن کی فکر کا تجزیہ کوئی سیدھا سادا اور آسان کام نہیں ہے۔ اس فقیر کی گدڑی میں کئی لعل ہیں۔ جن کی الگ الگ بازاروں میں الگ الگ قیمت اُٹھتی ہے تاہم شخصیت کی مکمل قدر و قیمت زیادہ ہی ٹھہرتی ہے۔ اس اعلیٰ قدر و قیمت اور وقعت کا سب سے بڑا سبب اُن کا وہ فکری عمل ہے جسے واٹسن نے نیم لفظی — Sub-verbal Speech BEHAVIOURISM مکتب فکر کے بانی قرار دیا ہے۔ اگر ہم تفکر (Thinking) کے بارے میں نئی نفسیاتی

تحقیق کو دیکھیں تو یہ اہم نکتہ اور موڑ سامنے آتا ہے کہ واٹسن کے اشارے کے مطابق تفکر کو سمجھنے کے لئے الفاظ کی اہمیت بڑھتی چلی جارہی ہے۔ تحقیق کا یہ میدان کہلاتا ہے اور اس کا بانی ایک ماہر ریاضی داں نوام چومسکی NOAM CHOMSKY ہے۔ اس میدان میں تحقیق کا رُخ یہ ہے کہ سوچنے کا عمل الفاظ کا مرہونِ منت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو سوچنے، ماضی کو یاد رکھنے اور یاد کرنے اور دوسرے انسانوں سے گفتگو کی جو غیر معمولی صلاحیت عطا فرمائی ہے اس سب کا ذریعہ الفاظ ہیں۔ نوام چومسکی کی تحقیق کا خُلاصہ اگر محض چند الفاظ میں بیان کرنے کی کوشش کی جائے تو وہ یہ ہے کہ سوچنے، یاد کرنے اور گفتگو کا جو عمل انسانی ذہن میں شروع اور مکمل ہوتا رہتا ہے اُسے الفاظ کے انفرادی در دلبست کے ذریعہ ہی سے سمجھا جا سکتا ہے اور سمجھا جانا چاہیئے۔

اس تحقیق کی روشنی میں ماہر القادری تفکر کے بادشاہ.... نظر آتے ہیں۔ ان کے پاس لاتعداد الفاظ اور ان الفاظ کو برتنے کے نہایت خوبصورت انداز موجود ہیں۔ اسی بنا پر وہ ہر ایک واردات قلبی کو خوبصورتی کے ساتھ بیان کرنے پر قادر ہیں۔ شاید یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ماہر القادری کا ڈکشن بھی انہیں فکر و اظہار کے ایک اعلیٰ مقام پر لے جاتا ہے۔ وہاں وہ ایک ماہر (EXPERT) ہی کی طرح کارفرما ہیں۔

اشعار ماہر القادری ؒ

لو بہ لو رنگ بدلتی ہے تجلی اُن کی ۞ دیکھنے والے لگا ہوں پہ بھروسا نہ کریں

میں تغافل کا گلا کرنے کو تھا رک گیا ۞ یہ بھی عالم التفات درست کا عالم نہ ہو

اتنی شمعوں کی ضرورت کیا ہے ۞ کیا ابھی اور اندھیرا ہوگا

چمن میں سوگ ہے اُس پر سب غنچے کا ۞ جو ایک رات بھی جی بھر کے مسکرا نہ سکا

چشم ساقی کی اثر فرمانیاں ۞ موج مے لینے لگی انگڑائیاں

سرنوشتِ ماہرؒ

یہ تحفۂ بیش بہا یعنی حالاتِ زندگی، کا یہ قلمی مسودہ (خود ماہر مرحوم کا قلمی)، مجھکو میاں سعید قادری (خلف ڈاکٹر ایوب قادری مرحوم) نے ہدیہ کیا ہے، کبھی کبھی خُردوں سے بھی بزرگوں کی شفقت مل جاتی ہے
فوٹو کاپی بنوا کے اصل تحریر کو بٹر پیپر پر منتقل کرانے کی کوشش کی جائیگی تاکہ مرحوم کا سوادِ تحریر اور تحریر دونوں "سرمہ چشم قارئین" بن سکیں۔

اس "سوانح ماہری" کے مندرجہ واقعات و کوائف کی حیثیت "سند" کی ہے اسلئے اسکی اشاعت اُسی شمارے میں کی جا رہی ہے جو ماہر القادریؒ سیمینار کی روداد و مقالات پر مشتمل ہے۔

مسودے پر تاریخ ہے ۱۱ اکتوبر ۱۹۷۷ء، عجیب اتفاق ہے کہ ۱۱ مئی ۱۹۷۸ء کی شب کے آخری لمحات ماہر مرحوم کے سفرِ آخرت کا آغاز ہیں یعنی ٹھیک سات مہینے بعد۔

؎ آسماں اُس کی لحد پہ شبنم افشانی کرے۔

(تسنیم مینائی)

منظور حسین — تاریخی نام ہے سنہ پیدائش ۱۳۲۳ ہجری: والد کا نام محمد معشوق علی جو ظریف تخلص کرتے تھے۔ والد مرحوم مزاجاً گوشہ نشیں تھے۔ ظریف عربی میں زیرک و دانا کو کہتے ہیں۔ ذہنی شگی کے لحاظ سے رشتہ داروں نے ظریف تخلص اختیار کیا تھا۔

مولد و وطن — کسیر کلاں ضلع بلند شہر (یو۔پی INDIA) یہ گاؤں علی گڑھ سے ۲۴ میل پر واقع ہے: ۱۹۲۶ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ پھر سلسلۂ تعلیم جاری نہ رہ سکا: فارسی کی ابتدائی کتابیں گلستاں تک والد مرحوم نے پڑھائی تھیں۔

میں نے جو کچھ حاصل کیا کتابوں کے مطالعہ سے حاصل کیا

۱۹۳۰ء میں حیدرآباد دکن جانا ہوا اور وہاں تقریباً پندرہ برس قیام
کئی محکموں میں سرکاری ملازمت کا بھی تعلق رہا۔ مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر یمین السلطنت
صدر اعظم، راشد الحروف کے بڑے قدر شناس تھے۔ مہاراجہ بہادر کی عنایت اور بندہ پروری
دکن میں میرے لئے زنجیرِ پا بن گئی!

مایۂ ملت، خطیب الامت نواب بہادر یار جنگ بہادر سے خاص رابطہ
رہا۔ بڑے بڑے جلسوں میں نواب بہادر یار جنگ کی تقریر تک میری نظم کا پروگرام رہتا۔
نواب صاحب نے مجمعِ عام کے سامنے حیدرآباد کے گیسٹ ہاؤس میں قائدِ اعظم سے راشد الحروف کا
تعارف کراتے ہوئے فرمایا کہ — "میری تقریروں اور اِن کی نظموں نے
حیدرآباد دکن کے مسلمانوں میں بیداری پیدا کی ہے"

حیدرآباد دکن اُن دنوں علم و فضل کا گہوارہ بلکہ یوں کہیے
مرجع و بغداد ثانی بنا ہوا تھا۔ وہاں سے بہت کچھ سیکھا اور بھرپور استفادہ کیا۔
ہر فن کی اعلیٰ درجہ کی کتابوں کے مطالعہ کے مواقع اور سہولتیں بھی حیدرآباد دکن
میں میسر آئیں۔

دکن کے زمانۂ قیام میں بس ایک برس باہر رہا۔ ۱۹۳۴ء میں
روزنامہ "مدینہ" (بجنور) کا رکن ادارہ رہا اور بچوں کے مشہور رسالہ "غنچہ" کی ایڈیٹری کے
فرائض بھی مجھ سے متعلق رہے۔ اسی سال عراق کا سفر کیا۔ بغداد شریف کے علاوہ کوفہ،
نجف، کربلا، مسیب، حلہ اور بابل کے آثار دیکھے۔

کچھ دنوں بمبئی میں فلمی گانے بھی لکھے۔ کئی فلموں میں میرے
گانے مقبول و مشہور ہوئے مگر نگارخانوں کی فضا سے دل اچاٹ ہو گیا!

۱۹۴۷ء میں متحدہ ہندوستان میں خونریز فسادات کا سلسلہ شروع
ہو گیا تھا۔ ہمارے گاؤں ([illegible]) پر بھی چالیس ہزار مسلح بلوائیوں نے

فاران

حمد للہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے مسلمان بھی رہے اور استقامت کا ثبوت دیا۔ زیادہ آدمی
ہندوؤں کے ہی مارے گئے۔ ہنگامہ تو تھا کہ مسلمانوں کی تنظیم و تربیت کی سعادت اسی
گنہگار کے حصہ میں آتی ہے۔ "اردو ڈائجسٹ" (لاہور) میں یہی تفصیل چھپ چکی ہے۔

۱۹۴۷ء کے ماہ نومبر میں کراچی آیا۔ ۱۹۴۹ء میں
ماہنامہ "فاران" نکالنا شروع کیا۔ بحمد اللہ تعالیٰ کے فضل سے اب تک جاری ہے۔ کراچی
میں میری بڑی بہن اور اہلیہ اللہ کو پیاری ہو گئیں جن کی قبروں کے نشان
بھی مٹ گئے ہیں۔

پاکستان آ کر دو برس عربی ادب کی تعلیم حاصل کی۔ قرأۃ الرشیدہ سے لیکر
مقدمہ ابن خلدون تک سبقاً سبقاً پڑھا۔ ۱۹۵۳ء میں زیارت حرمین شریفین کی سعادت حاصل ہوئی۔
۱۹۶۶ء میں ساؤتھ افریقہ کے مسلمانوں کی دعوت پر وہاں گیا اور ڈربن، جوہانس
برگ، کیپ ٹاؤن، ونڈہوک، نیو کاسل وغیرہ شہروں میں [illegible] پڑھے اور تقریریں کیں۔
وہاں کے نعتیہ شعر و ادب نے بڑی پذیرائی کی۔ ڈربن میں اردو کلاس کا افتتاح کیا۔ اس کے بعد
دو ہفتہ نیروبی (کینیا) — مشرقی افریقہ میں قیام رہا۔ وہاں بھی بڑی دھوم کے
دورے ہوئے اور بزم اقبال میں تقریر کی۔ اس کے بعد — روم (اٹلی)
اور اسپین کے تاریخی مقامات دیکھے۔ مسجد قرطبہ اور قصر الحمرا کا بھی نظارہ
کیا۔ پھر لندن، برمنگھم، مانچسٹر، لیک ڈسٹرکٹ کی سیر کی۔ کئی مقامات پر نعتیں
بھی پڑھیں۔

انگلستان کے بعد پیرس، جنیوا، استنبول، بیروت اور دمشق کی سیاحت کی
اور آخر میں دوسری بار حجاز مقدس میں حاضر ہوا۔ ۱۹۵۳ء میں زیارت حج کے بعد ۱۹۶۶ء میں
قسمت نے پھر یاوری کی۔

ع دربار میں حاضر ہے اک شاعر آوارہ!

احباب سے دعائیں بھی ہو چکیں

۱۹۷۶ء میں برمنگھم، لندن اور مانچسٹر کا سفر کیا۔ مشاعرے بھی پڑھے

ٹی وی سے میرا کلام بھی نشر ہوا۔ اس کے بعد قاہرہ کی سیر کی اور وہاں سے

تیسری بار پھر حرمین حجاز میں حاضری کا موقع ملا۔ رمضان کا مہینہ تھا! چند دن مکہ معظمہ

میں حاضری رہی

طوفان تجلی میں انوار کا سفینہ ہے

کعبہ کی حسین راتیں رمضان کا مہینہ ہے

اس کے بعد مدینہ منورہ میں حاضر ہوا اور وہیں عید کی۔ اس طرح برسوں کی

تمنا بر آئی۔

تصانیف

نعتوں اور نظموں کی کتابیں (۱) محسوسات ماہر (۲) نغمات ماہر (۳) جذبات ماہر

(۴) فردوس (۵) ذکر جمیل (نعتیہ کلام)

سیرت النبی پر:- (۱) آخری رسولؐ (۲) دُرِ یتیم (سیرت پر ناول)

ناول:- (۱) کردار (۲) جب میں خزاں تھی

افسانوں کے مجموعے (۱) نگینے (۲) طلسم حیات (۳) شباب

انشائیے:- (۱) زود پشیماں (۲) محبت بھرے خطوط (۳) کاغذی پیرہن

سفرنامہ — کاروان حجاز

ان کے علاوہ قول فیصل — انسان اور کائنات وغیرہ

چند کتابچے بھی چھپے ہیں! اللہ بس باقی ہوس۔

ماہر القادری۔ ۱۱؍ اکتوبر ۱۹۷۷ء

صابر براری

"تاریخ رحلت جناب ماہر القادری"

۱۳۹۸ھ

شاعرِ خوش نوا آج رخصت ہوا
سُونا سُونا سا ہے گلشنِ شاعری

اب کہاں ہے گُلوں پہ وہ پہلی پھبن
اب کہاں لالہ زاروں میں وہ تازگی

لے گیا ساتھ ساری حسیں خوبیاں
وہ تبسّم وہ انداز وہ دلبری

آج اہلِ ادب کے ہے لب پر یہی
ماہر القادری ماہر القادری

سالِ رحلت کو صابرؔ یہ مصرع کہو
ہیں مکینِ اِرم ماہرُ القادری

۱۳۹۸ھ

مطبوعہ رسالہ عالمگیر (لاہور) خاص نمبر ۱۹۳۶ء

حسنِ فاتح (نظم)

مولانا منظور حسین صاحب ماہر القادری

رہا ہے قلعۂ شاہی پہ حُسن کا پرچم
رخِ ایاز کی سوگند غزنوی کی قسم

شعاعِ حُسن کا پرتو ہے انقلاب بدوش
جلو میں جس کے ہے طوفانِ رنگ و بو کا جوش

شرابِ حسن کی مستی ارے خدا کی پناہ
کیا ہے جس نے فرشتوں کے زہد کو بھی تباہ

کیا ہے حسن نے دنیا کی روح کو تسخیر
یہ دام وہ ہے ہوئے جس کے کجکلاہ اسیر

فضائے حسن وہ لبریز کیف و مستی ہے
گھٹا کی طرح جہاں زندگی برستی ہے

اُدھر شکوہِ حکومت برنگِ تیغ و سپاہ
اِدھر بہ نازِ تغافل بس ایک نیچی نگاہ

اُدھر غرور و تحکّم ہے بادشاہی کا
اِدھر اشارۂ مبہم سا کم نگاہی کا

اُدھر بشوکتِ شاہانہ ہاتھ میں تلوار
اِدھر جواب میں اندازِ نرگسِ بیمار

اُدھر چراغ سرِ راہ دل کی آہوں کا
اِدھر فروغِ تبسّم بھری نگاہوں کا

اُدھر ہلاکِ تغافل محبّت مفتوح
اِدھر رگوں میں مچلتی ہوئی سی فتح کی روح

اُدھر ہیں برگِ محبت پہ اوس کی بوندیں
اِدھر ہیں نیّرِ انوارِ حُسن کی کرنیں

یہ خواب ہے کہ فسانہ ہے یا کہانی ہے
قیامتیں ہیں مجسّم کہ اک جوانی ہے

نا ماہر القادریؒ کی یہ نظم "حسن فاتح" ایک خوبصورت رنگین تصویر سے متعلق ہے۔ جو عالمگیر کی اسی اشاعت میں شامل ہے

مشرق ماہری
(بھارت)

اسرار سہاوری

ماہر القادری مرحوم کی یاد میں

قافلہ لٹ گیا کہاں دل کا! ٭ بجھ گیا ہے چراغ منزل کا

سب قطرہ ہائے خوں کا حساب ٭ حق ادا کر دیا غمِ دل کا

زندگانی تھی موجۂ طوفاں ٭ کبھی طالب ہوا نہ ساحل کا

سربلندی حق تھی اس کو عزیز ٭ مدّعا تھا فقط یہی دل کا

دستِ قاتل کو بڑھ کے چوم لیا ٭ حوصلہ کوئی دیکھے بسمل کا

خمِ گیسوئے دیں کی الفت میں ٭ ایک دیوانہ تھا سلاسل کا

اپنے لطفِ بیاں کے صدقے میں ٭ ہر جگہ تھا وہ میر محفل کا

بس چلا کچھ نہ دشمنِ دیں کا ٭ توڑ ڈالا حصار باطل کا

یاد ماہر کی آج پھر آئی

زخم لو دے اٹھا میرے دل کا

۴؍ جولائی ۱۹۸۶ء

برادرم مینائی صاحب با تسلیم و نیاز

حسب الحکم ایک تازہ غزل ارسال ہے۔

ماہر بہت یاد آتے ہیں، اور مجھے تو یوں بھی کہ میرے گھر کے پاس جو پارک ہے وہ انہی سے منسوب ہے اور ان کے نام کی لوح لگی ہوئی، دن میں کئی بار گذر ہوتا ہے اور نظر پڑتے ہی نہ معلوم کیا کیا یاد آجاتا ہے، وہ ان کی شوخیاں، وہ ان کی بدمزاجیاں، احباب کی شرارتوں پر ان کی جھونج اور پھر وہ معصوم مسکراہٹ، خوب آدمی تھے، ایسے لوگ کم ہوتے ہیں، غور کرو ایک دیہاتی وہ بھی غریب گھرانے کا۔ پھر اُس نے اپنے آپ کو کس طرح تربیت کیا اللہ اللہ!!

فاران کو ذرا ترتیب کے لحاظ سے مہذب کرنے میں کوئی حال صرف نہیں ہوگا اور یہ کام بخوبی نہایت آسانی سے کیا جاسکتا ہے مگر یار تم ہمیشہ کے کاہل ہو۔ اس طرف توجہ دینے کی اشد ضرورت ہے۔ باقی عندالملاقات۔

(غزل)

تابش دہلوی

یوں تذکرۂ حسن کا آغاز کیا ہے ❊ اک اک نگہِ شوق کو آواز کیا ہے

کیونکر نہ ہو سرمایۂ ہستی میں اضافہ[1] ❊ ہم نے ترے ہر غم کو پس انداز کیا ہے

اب دولتِ دارین ہے قیمت اُسی غم کی ❊ جس غم پہ مرے دل نے بہت ناز کیا ہے

صیاد! اسیری سے نہ کرنا اِسے تعبیر ❊ ہم نے ہی کوئی حیلۂ پرواز کیا ہے

وہ ہجر کا احوال ہو یا وصل کی رُوداد ❊ ہر قصہ ترے نام سے آغاز کیا ہے

بے واسطۂ دید تجھے دیکھا ہے ہم نے[1] ❊ ایک ایک نظر کو، نظر انداز کیا ہے

ہشیار خبردار دل و جان سے تابش

پھر اُس نے بپا معرکۂ ناز کیا ہے

---

[1] یہ رنگ تابش کا خاص رنگ شاعری ہے جس میں اب اُن کا کوئی حریف نہیں ہے۔

۲۰ جولائی ۱۹۸۶ء

محبِّ ذی احترام۔ خلوص و سلام

آج مئی کا فاران ملا۔ شکریہ۔ اپنے دلِ بیمار کی کرم فرمائیوں۔ اور چھوٹے صاحبزادے کی مسلسل گوناگوں بیماریوں کی وجہ سے یہ ہو نہیں سکا کہ مئی نمبر کے لئے مرحوم کے متعلق کچھ نہ کچھ لکھتا اور بغیر طلب نذرِ فاران کرتا۔ مولانا مرحوم سے دلی تعلق اور ربطِ خصوصی کے اظہار کا عملی مظاہرہ بھی کرتا۔ باور فرمایئے تو اراتیغ زنی رن میں آپکے دریدلان فقرات لے تیر و نشتر کا کام کیا کہ بڑے تو اپنی اپنی دُکانیں سجانے میں مصروف ہیں۔ انہیں غمِ جماعت سے فرصت کہاں جو "غمِ ماہر" کے لیے وقت نکالیں۔

"ماہرؔ کے بارے میں آپ کو تین ۳ عدد مضامین و مقالات۔ نظموں اور غزلوں کا بجز انتظار ہے۔"

ان حقیقت افروز اور عبرت انگیز جملوں سے ایک "تحریک" ہوئی جس نے ایک نظم کی صورت اختیار کرلی۔ میری عجیب شاعرانہ فطرت ہے۔ میں پریشان ہوتا ہوں تو مدتوں خاموش رہتا ہوں۔ لیکن جب اس عالم میں شعروں کا نزول شروع ہو جاتا ہے تو پھر وہی کیفیت ہوتی ہے کہ۔ "رُکتی ہے میری طبع تو ہوتی ہے رواں اور" یہ فطرت کا عطیہ ہے اور انعامِ قدرت۔ اللہ کا شکر ہے کہ ایک ہی نشست میں آج ہی ایک تازہ نظم ماہرؔ القادری پر ظہور پذیر ہو گئی۔ اسے آئندہ شمارہ کیلئے بھیج رہا ہوں۔ یہ نہ موعودہ ہے نہ متوقعہ۔ دلِ غمزدہ کی آواز ضرور ہے۔ جو ماہرؔ مرحوم کی ادبی خصوصیات کی بھی مظہر ہے اور اخلاقی محاسن کی آئینہ دار بھی۔

اس سے پہلے ایک لفافہ اور بھیج چکا ہوں جس میں آپ کی مطلوبہ حمد تو حیّ لا یموت ہے اور موت کے موضوع پر کچھ اشعار بھیجے ہیں۔ امید ہے کہ وہ لفافہ مِل چکا ہوگا۔ اس نظم کی رسید کا بے چینی سے منتظر رہوں گا۔ دعا فرمایئے کہ اللہ مجھ نااہل کو امتحانِ صبر و ضبط میں کامیاب فرمائے۔ شاید صاحبزادے کا اپریشن ہو۔ آپ کی آنکھ میں موتیا آجانے سے تشویش ہے لیکن شافیِ مطلق شفا دے گا۔ میں اس منزل سے گزر چکا ہوں۔ اب تو یہ منزل زیادہ دشوار نہیں رہی ہے مسبب الاسباب سبب صحت پیدا کر دے گا۔ والسلام۔

دعاگو و دعاجو
صباؔ متھراوی

ماہرُ القادری

صباؔ متھراوی

تو ادب کا نشاں ماہر القادری ✿ تو غزل کی زباں ماہر القادری
"حق زباں" "حق بیاں" ماہر القادری ✿ صدق کا ترجماں ماہر القادری
"نکتہ بیں" نکتہ داں ماہر القادری ✿ شاعرِ خوش بیاں ماہر القادری
عاشقوں کی زباں ماہر القادری ✿ اے حسینوں کی جاں ماہر القادری
تیری "غزلیں" مچلتی ہوئی حسرتیں ✿ "تیری نظمیں" جواں ماہر القادری
"تیرے اشعار" پھولوں بھری ڈالیاں ✿ گلستاں۔ گلستاں۔ ماہر القادری
"تیرے مضموں" منھ بولتے آئینے ✿ ضوفگن ضوفشاں۔ ماہر القادری
"حق بیانی" کا سورج چمکتا ہوا ✿ تیرا "نور بیاں" ماہر القادری
دین و ایماں کی پھیلی ہوئی چاندنی ✿ تیری "تنویرِ جاں" ماہر القادری
صاف و شفّاف و روشن جوانی تیری ✿ مثلِ موجِ رواں ماہر القادری
تیری سانسیں مہکتی ہوئی خوشبوئیں ✿ صورتِ گلستاں ماہر القادری
باغِ توحید کے بُلبلِ خوشنوا ✿ نعت گو نعت خواں ماہر القادری
جنگ جاری رہی تیری۔ "الحاد" سے ✿ حق کے تیر و سناں ماہر القادری
ہر غلط لفظ پر ٹوکتا ہی رہا ✿ روحِ "نقد و بیاں" ماہر القادری
کوئی بھولے! نہ بھولے گا لیکن ہمیں ✿ لطف و شعر و زباں ماہر القادری
خاکِ "خلد حرم" تیری تربت بنی ✿ صدق کے آسماں ماہر القادری

تو "نقیبِ ادب" تو "ادیبِ زباں"
"شبنمی نغمہ خواں" "شعلہ گو حق بیاں"
ماہر القادری۔ ماہر القادری

اسرار احمد سہاوری

ماہر مرحوم

مولانا ماہر القادری کی یاد آوری پر مضمون عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ یاد اسے کیا جاتا ہے جسے کچھ عرصے کے لئے بھلا دیا گیا ہو۔ جسے بھلایا ہی نہ ہو اسے یاد کیا کریں۔ لیکن چونکہ ذکر حبیب بہر حال وصل حبیب کا نعم البدل ہے اسی لئے ان کا ذکر کئے لیتے ہیں۔

ماہر صاحب ایک خوش الحان اور عذب البیان شاعر تھے۔ اور شاعر بھی تلمیذ الرحمٰن قسم کے تھے۔ کبھی کسی کی شاگردی اختیار نہیں کی۔ طبیعت فطرتاً موزوں لائے تھے۔ کثرتِ مطالعہ نے اس کو جلا دی اور حاصلِ مطالعہ کو شعر کی نذر کر دیا۔ قدرت نے آواز بھی ترنم ریز دی تھی اور شخصیت میں بھی حسین دلآویزی مرحمت فرمائی۔ اسی لئے مشاعرے کو لوٹ لیتے تھے۔ اخلاق میں وسعت تھی اور مزاج میں سادگی۔ محبت کا جذبہ بھی قدرت کا ایک عظیم عطیہ تھا۔ اسی محبت کے جذبے کو طرح طرح سے شعر میں بھر دیتے تھے۔ اس جذبے نے ہی خلوص۔ دیانت اور سوز و ساز کی پرورش کی اور اسی کے سہارے سے ماہر "پرورشِ لوح و قلم" کرتے رہے۔ آخر وقت تک کی اور خوب کی اور چونکہ جذبات کے یہ اجزا زیادہ تر غزل سے متعلق ہیں اس لئے ان کی غزل بڑی خوبیوں سے متصف ہو کر رہی۔ میں یہاں مرحوم کو ان کی غزل کے حوالے سے ہی یاد کرنا چاہتا ہوں ورنہ تو وہ نثر۔ نظم۔ غزل ایک سی سہولت و روانی سے لکھتے تھے۔

ماہر مرحوم کی غزل کا جائزہ لینے سے پہلے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ خود غزل کی ماہیت پر ایک سرسری نظر ڈال لیں تاکہ اس کو بنیاد بنا کر مرحوم کی غزل کو پرکھنے میں آسانی ہو جائے اور مرحوم کی غزل کا مقام اور درجہ آسانی سے متعین ہو سکے۔ اردو شاعری میں سب سے زیادہ مقبول صنف غزل ہی ہے۔ اپنے لغوی معنی کے لحاظ سے غزل عشق و محبت کے جذبات کو بیان کرنے کے لئے مخصوص ہونی چاہئے تھی لیکن غزل ان حدود میں محدود نہ رہ سکی اور شروع سے ہی اس میں ہر قسم کے مضامین ادا کئے جانے لگے۔ غالباً اس ریزہ کاری کی وجہ یہ ہوگی کہ اس میں تسلسل کو ضروری قرار نہیں دیا گیا اور اس کا ہر شعر عمدہ مطلب معانی کا حامل ہونے لگا۔ شاعر اس آزادی سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور جو جذبہ وقتی طور پر پیدا ہو یا جو خیال ذہن میں آ جائے ایک شعر میں بند کر دیتے ہیں۔ اس سے ایک سہولت اور یہ پیدا ہو جاتی ہے کہ غزل کو ایک ہی نشست میں کہنا ضروری نہیں ہوتا۔ غزل کی ایک اور عجیب خصوصیت یہ ہے کہ یہ صرف فارسی اور اردو میں ہی پائی جاتی ہے کسی اور زبان میں اس کا وجود نہیں۔ غزل کی ابتداء فارسی میں ہوئی اور رودکی۔ سعدی۔ حافظ وغیرہ نے۔ تصوف۔ اخلاق۔ فلسفہ و

حکمت وغیرہ کے مضامین کو اس میں شامل کر دیا۔ البتہ جذباتِ محبت کے سوز و گداز اور ترنم کو اس میں ضرور شامل رکھا اسی
لئے اس کو زیادہ تر ترنم سے پڑھنے بلکہ گانے کا رواج بھی عام ہوگیا۔ اس طرح غزل وارداتِ قلبیہ کے لئے مخصوص ہوگئی
اور اس میں عموماً داخلی مضامین نظم کئے جانے لگے۔ اسی لئے جن شعرا نے غزل کے اس تار و پود کا خیال رکھا ان کی غزلوں کو
بے پناہ قبول عام حاصل ہوا۔ غزل کی خصوصیات میں تاثیر۔ سوز و گداز۔ شوخی۔ سادگی۔ صداقت اور ایمانیت شامل ہیں۔ اب
ہم ماہر مرحوم کے کلام کو اس کسوٹی پر پرکھ کر دیکھتے ہیں۔

سب سے پہلے تاثیر کلام کو لیجئے کہ کلام کی مقبولیت کی یہی سب سے بڑی بنیاد ہے اور مجھے یہ کہنے میں باک نہیں کہ
اس ذیل میں مرحوم کے بہت ہم عصر شعرا ان کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ دعوے کی دلیل کے طور پر چند اشعار پیش کرنا ضروری ہیں۔
کیونکہ دعویٰ بلا دلیل ناقص شمار کیا جاتا ہے اور دل کو نہیں لگتا۔ ایک چھوٹی بحر کی غزل کے چند اشعار اثر آفرینی کے ذیل
میں ملاحظہ ہوں۔ سادگیٔ ادا۔ بلکہ سہل ممتنع کا رنگ۔ روانی۔ ترنم۔ جذبے کی شدت۔ گداز کی حدت ہر شعر سے ظاہر ہے۔ میر
کی چھوٹی بحر کی یاد تازہ کرتی ہے:۔

کس قیامت کی گھٹا چھائی ہے۔ ؎ دل کی ہر چوٹ ابھر آئی ہے۔
درد بدنام، تمنا رسوا ؎ عشق رسوائی ہی رسوائی ہے۔
اس نے پھر یاد کیا ہے شاید ؎ دل دھڑکنے کی صدا آئی ہے۔
دل تمنا سے ہے کتنا بیزار ؎ ٹھوکریں کھا کے سمجھ آئی ہے۔
تم سے ماہر کو نہیں کوئی گلا ؎ اس نے قسمت ہی بری پائی ہے۔

دوسری بات سوز گداز کی ہے۔ ماہر قنوطی پسند شاعر نہیں تھے۔ ان کا شاعرانہ حوصلہ بہت بلند تھا۔ وہ مزاجاً مایوس
ہو بھی نہیں سکتے تھے۔ بزم و محفل آرائی ان کا مخصوص مشغلہ تھا۔ لطائف و ظرائف کی ہر وقت پھلجھڑیاں چھوڑتے رہتے
لیکن با ایں ہمہ دل میں سوز گداز کی گرمی بھی قدرتی تھی اور یہی نہیں بلکہ اس کی باقاعدہ پرورش بھی کرتے تھے۔ چھوٹی بحر
میں سہل ممتنع کی ایک غزل کے چند اشعار سے

دل میں اب آواز کہاں ؎ ٹوٹ گیا تو ساز کہاں
آنکھ میں آنسو لب خاموش ؎ دل کی بات اب راز کہاں
دل خوابیدہ روح فسردہ ؎ وہ جوشِ آغاز کہاں

گداز قلب کے ساتھ بلند نگاہی اور جہانِ رنگ و بو سے بے نیازی کا سماں ملاحظہ فرمائیے۔ ترنم اور نغمگی بھی قابلِ دید ہے:۔

مجھے فریب نہ دے اے نشاطِ میخانہ ؎ میں سن رہا ہوں صدائے شکستِ پیمانہ
جہاں جنوں سے بھی ہے چشمکِ حریفانہ ؎ گزر رہا ہے اب ان منزلوں سے دیوانہ

نہ آرزوئے بہاراں نہ خوفِ دورِ خزاں ٭ نہ جانے کس نے رکھی تھی بنائے ویرانہ

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ غزل کے اجزا میں جذبۂ و فن کے ساتھ فلسفہ و حکمت اور پند و موعظت کو بھی شامل کر لیا گیا ہے۔ لیکن یہاں بھی کیف و ترنم۔ ایمائیت و لطافت کے اجزا کی شرکت ضروری ہے۔ موعظت میں کیف و ترنم اور ایمائیت کا حسین امتزاج ماہر مرحوم کی اس غزل میں ملاحظہ فرمائیے ؎

راز ہستی کی یہاں کس کو خبر ہوتی ہے ٭ زیست اک سلسلۂ شام و سحر ہوتی ہے
میں تیری یاد کو اے دوست دعا دیتا ہوں ٭ زندگی غم میں بھی راحت سے بسر ہوتی ہے
ٹھوکروں ہی سے تو ملتا ہے سراغِ منزل ٭ ظلمتوں سے ہی نمودارِ سحر ہوتی ہے

ماہر مرحوم کو شروع ہی سے زبان و بیان پر بڑی قدرت حاصل رہی۔ اردو آغوشِ مادر میں سیکھی۔ پھر کثرتِ مطالعہ سے بہت کچھ حاصل کیا۔ دن رات اساتذۂ فن سے صحبت رہی۔ اس لئے زبان پر ماہرانہ اور استادانہ قدرت حاصل ہو گئی تھی۔ صحتِ زبان و بیان کا خود بھی بہت اہتمام کرتے تھے اور دوسروں سے بھی یہی توقع رکھتے تھے۔ زبان کو بازیچۂ اطفال بنانا ان کو سخت ناگوار تھا۔ اس ضمن میں اپنے قریبی دوستوں کی کوئی رعایت نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ فاران کے سینکڑوں صفحات "ہماری نظر میں" کے عنوان کے تحت ان کی اس بے مثال کاوش کے گواہ ہیں۔ الفاظ کا انتخاب۔ تراکیب کی برجستگی۔ تشبیہ و استعارے کی نزاکت۔ رعایتِ لفظی کا بانکپن ان کی اکثر غزلوں میں نظر آتا ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار میں مضامین کی نزاکت۔ جذبے کی گرمی۔ محبت کی نامعلوم سی خلش۔ عبارت کی روانی اور ترنم ملاحظہ ہو۔ ہر لفظ اپنی جگہ پر ایک تابدار نگینہ معلوم ہوتا ہے۔ فن و جذبے کی آمیزش۔ عبارت کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ ترنم کا مدھر رچاؤ ہر شعر میں نغمہ زن ہے۔ ؎

اب نہیں ہے وہ نگاہِ شوق کی بے مائیگی ٭ بند آنکھوں کو مبارک لذتِ نظارگی
گریۂ شبنم سے پھولوں کو سہارا مل گیا ٭ آنسوؤں نے پھونک دی گلشن میں روحِ تازگی
یاد آتے ہی ترے دنیا کے غم یاد آ گئے ٭ ظلمتوں میں گم ہوئی جاتی ہے پھر تابندگی
ہر نظر لطفِ تجلی ہر نفس پیغامِ دوست ٭ ایسے عالم میں ہے کس کو فرصتِ آوارگی

اگرچہ ماہر مرحوم کی غزلیات میں آپ کو آمد ہی آمد نظر آئے گی آورد کا کہیں نشان بھی نہیں ملے گا۔ لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ وجدان نے شعور کو بالکل ہی تحت الشعور میں پہنچا دیا ہو۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں باوجود وجدانی وارفتگی کے پورے شعور و آگاہی کے ساتھ کہتے ہیں۔ میرا مطلب غزل گوئی کے مقامات سے ہے۔ یہاں ماہر مرحوم کو اپنے فن۔ جذبے

ریاض۔ احساس اور فکر کا پورا ادراک رہتا ہے۔ وہ ایک وجدانی کیفیت میں ہی ان تمام چیزوں کا امتزاج کرتے چلے جاتے ہیں۔ غزل میں اکثر فکر و فن آپ کو شیر و شکر نظر آئے گا۔ مگر اس امتزاج کے پورے شعور کے ساتھ۔ وہ کبھی کبھی اس شعور کا اظہار بھی کر دیتے ہیں۔ لیکن اس احتیاط کے ساتھ کہ یہ اظہار تعلّی کی حد کو نہ پہنچ جائے۔ تعلّی سے بچنے کی ہمیشہ سعی بلیغ کرتے رہتے تھے۔ دیکھئے خود شعوری کا کتنے لطیف پیرائے میں اظہار کرتے ہیں۔ اس طرح کہ قاری یا سامع کی طبع نازک پر گراں نہ گزرے۔

اک طرف بھی نظر اے دیدۂ صاحب نظراں ؏ میں نے ذروں سے تراشے ہیں ستاروں کے جہاں
دل کی چوٹیں کہیں آواز میں ڈھل سکتی ہیں ؏ کتنی پر سوز ہے اس پر بھی ادھوری ہے فغاں
ہاں دعا دے میری اس خوش نگہی کو اے دوست ؏ اس سے پہلے تیرے جلوؤں کا یہ عالم تھا کہاں
گرمئ نالۂ بلبل کا اثر کیا کہئے ؏ لالہ و گل کی جبینیں بھی ہیں شبنم افشاں

ایک اور غزل میں آپ کو دو مختلف کیفیات کا امتزاج ملے گا اور دونوں کیفیات کو پوری قدرت زبان و بیان کے ساتھ ادا کیا گیا ہے لطافت بیان۔ نازک ایمائیت اور رنگینی نے کہیں ساتھ نہیں چھوڑا ہے۔ پھر آپ ملاحظہ فرمائیں کہ مقطع میں اپنی شعوری کیفیت کا بھی برملا اظہار کر دیا ہے۔ اس غزل میں تین شوخ رنگوں سے قلم کاری کی ہے۔ ایک تو حقیقت سے تعلق خاطر کا اظہار پھر محبت کے جذبے کو ارتقائی مدارج سے ہمکنار کیا ہے۔ اور مقطع میں حقیقت کا رنگ شوخ کر دیا ہے۔ ؎

رضائے دوست جہاں لازمی نہیں ہوتی ؏ کچھ اور چیز ہے وہ بندگی نہیں ہوتی
دلوں کے واسطے نور یقیں ضروری ہے ؏ فروغ مہر سے تابندگی نہیں ہوتی

اس کے بعد مجاز کا انتہائی لطیف رنگ ملاحظہ ہو۔ ایمائیت کی نزاکت وجد آفریں ہے۔ ؎

تسلیوں سے بھی غم میں کمی نہیں ہوتی ؏ یہ بات وہ ہے کہ جو گفتنی نہیں ہوتی
لطافتِ نگہہ ملتفت کا کیا کہنا ؏ کبھی کبھی تو یہ محسوس بھی نہیں ہوتی

آخری شعر میں اپنے فن کے شعور اور آگاہی کا کس لطافت کے ساتھ اعلان کرتے ہیں۔ ؎

یہ لازمی ہے کہ دل بھی شریک ہو ماہرؔ ؏ دماغ ہی سے فقط شاعری نہیں ہوتی

دیکھئے سلام بہت لوگوں نے لکھے ہیں اور مختلف لوگوں کو مخاطب کر کے لکھے ہیں۔ گویا ان کی نوعیت تسلسلِ معانی و بیان کے لحاظ سے ایک نظم کی ہے۔ ماہر مرحوم نے ایک سلام ایسا لکھا ہے جس میں ہر شعر میں مخاطب بدل گیا ہے اور یہ اس وجہ سے کہ غزل میں تسلسلِ معانی و مطالب بذاتِ خود مطلوب نہیں۔ اس طرح سلام کو بڑی چابکدستی سے غزل کے رنگ

میں ڈھال کر عجب لطفِ نیرنگی پیدا کر دیا ہے۔ پھر طرفہ تماشا یہ ہے کہ طرزِ بیان میں اور معانی میں بھی تغزل کے ساتھ سلام کی ثقاہت اور پاکیزگی کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ یہ کرشمہ کوئی انتہائی قادر الکلام شاعر ہی دکھا سکتا ہے۔ کم از کم مجھے یہ انوکھا امتزاج اس خوبصورتی کے ساتھ کہیں اور نظر نہیں آیا۔ فرماتے ہیں ؎

شاخیں جھک جھک کے کریں جب گل و ریحاں کو سلام ✽ میری جانب سے بھی یارانِ گلستاں کو سلام

کاروانِ دلِ بے تاب ہے منزل کے قریب ✽ اب ہمیشہ کے لئے عمرِ گریزاں کو سلام

وحشتِ عشق پہ ہنستے ہوئے چہروں کی قسم ✽ صبح کرتی ہے مرے چاک گریباں کو سلام

کوچۂ عشق کے ہر خاک بسر کو سجدہ ✽ منزلِ شوق کے ہر بے سر و ساماں کو سلام

اب مجھے خود ہی بدلنی ہے زمانے کی فضا ✽ آخری بار مرا گردشِ دوراں کو سلام

لالہ و گل میرا مقصود ہیں لیکن ماہرؔ ✽ پھر بھی کانٹوں سے الجھتے ہوئے داماں کو سلام

فارسی کے ایک مشہور قطعے میں غزل کے اشعار کی صفات بیان کی گئی ہیں۔ شاعر نے بہت سے اجزائے ترکیبی گنوانے کے بعد آخر میں تان اس پر توڑی ہے کہ بہترین شعر وہ ہے جس میں " خمارِ چشمِ ساقی " کی بھی آمیزش ہو۔ بغیر اس خمار کی آمیزش کے رنگ چوکھا نہیں آتا۔ کہتا ہے ؎

دلے با بادۂ لطفِ حریفاں ✽ خمارِ چشمِ ساقی نیز پیوست

دیکھئے ماہر مرحوم کو اس حقیقت کا کس قدر احساس اور شعور تھا۔ اس قبل کا ایک شعر پہلے پیش کر چکا ہوں جس میں فرمایا ہے ؎

یہ لازمی ہے کہ دل بھی شریک ہو ماہرؔ ✽ دماغ ہی سے فقط شاعری نہیں ہوتی

اب مندرجہ ذیل غزل میں جو مجازی مجاز ہے " خمارِ چشمِ ساقی " کی جلوہ آرائیاں ملاحظہ فرمائیے۔ مطلع رجائیہ انداز میں شروع کرتے ہیں ؎

عہدِ غم دورِ مصیبت بھی گزر جائے گا ✽ یہ بھی طوفان کسی روز گزر جائے گا

اللہ اللہ ترے گیسو کا مزاج برہم ✽ آج شیرازۂ کونین بکھر جائے گا

پرسشِ غم سے کہیں ذوقِ خلش جاتا ہے ✽ دلِ بے تاب ٹھہرنے کو ٹھہر جائے گا

شکوۂ ہجر پہ ہو جائیں گے عارض گلنار ✽ اور بھی رنگ رخِ یار نکھر جائے گا

شاید اس وقت وہ آئیں گے تسلی دینے ✽ دردِ تسکین کی حد سے بھی گزر جائے گا

ان نگاہوں سے یونہی ربط رہا گر ماہرؔ
میرا اندازِ غزل اور سنور جائے گا

ابھی آپ نے حسنِ مجاز اور خمارِ چشمِ ساقی کا لطف اُٹھایا۔ اب ذرا حقیقت کے رنگ کا غلبہ ملاحظہ فرمایئے۔ نزاکتِ
رغ لائق توجہ ہے۔ ؎

زہے تصور! خوشا تخیل، تبارک اللہ یاد تیری ❊ نظر نظر محو بندگی ہے نفس نفس اب نماز میں ہے
کبھی ہے باطل پہ حق کا دھوکہ کبھی حقیقت مجاز میں ہے ❊ ابھی تری چشمِ خود تماشا کشا کشِ امتیاز میں ہے

نے فقیرانہ و قلندرانہ زندگی گزاری۔ خیال بلند۔ نگاہ ارجمند۔ لُطف نگہِ یار پہ سب کچھ لُٹا دینے والے۔ معاش و
شیت میں فکرِ فردا سے بے نیاز۔ کسی جابر سلطان کے آگے سر نہیں جھکایا۔ غمِ دنیا و روزگار سے نہایت بے نیازانہ گزر گئے
شقِ خدا اور رسول ؐ و عرفانِ الٰہی نس نس میں جاری و ساری تھا لیکن بایں ہمہ خانقاہیت اور تعطل سے سخت بیزار تھے
لئے ہر نظم میں آپ دیکھیں گے کہ رجز یہ رنگ اور جارحانہ انداز نمایاں رہتا ہے۔ میں یہاں نظم کا معاملہ تو نظر انداز کرتا ہوں
نکہ یہ اس مضمون کا کینوس نہیں۔ صرف غزل کا ذکر کرتا ہوں کہ غزل میں بھی جب اس قسم کی خیالات کی رو گذری ہے تو انداز
ز یہ و جارحانہ ہو گیا ہے۔ اسی لئے وہ زندگی بھر اپنے نفس سے بھی برسرپیکار رہے اور دشمنانِ دین و اخلاق سے بھی
لئے اخلاق گریز اور خدا دشمن ادیبوں کا ٹولہ انھیں زندگی میں بھی نظر انداز کرتا رہا اور آج بھی منہ موڑے ہوئے ہے
ین یہاں تو "اِنْ اجْرِیَ عَلَی اللہ" والا معاملہ ہے۔ اُن کی شہرت و قبولیت دنیا پرست لوگوں پر منحصر نہیں ہے لیکن میں
رحوم کی بے نیازی۔ جہد شناسی۔ رجزیہ انداز کا ذکر کر رہا تھا۔ تمثیلاً دو تین شعر ملاحظہ ہوں۔ ؎

جنوں کے راستے سونے پڑے ہیں ❊ نہ ہنگامے نہ رہبر ہے نہ راہی
وہی دل اور اُمیدوں کا طوفاں ❊ وہی غم اور اس کی بے پناہی
یقین کے ساتھ شانِ بے نیازی ❊ وہ درویشی ہے رشکِ کج کلاہی

مری دنیا ہے بس قرآن و شمشیر
نہ دو مجھ کو فریبِ خانقاہی

غالب کی زبان میں اپنے عجز کے اظہار پر اس مضمون کو ختم کرتا ہوں۔ ؎

صد جلوہ روبرو ہے جو مژگاں اُٹھایئے ❊ طاقت کہاں کہ دید کا احساں اٹھایئے

ایک شعر

جی چاہتا ہے سُنّتِ آدم ؑ ادا کروں ❊ دنیا سنوار دوں کوئی ایسی خطا کروں

شبنم رومانی

شاہ فیصل شہید

بدلتی ہوئی دنیا، بدلتے ہوئے معاشرے اور بدلتے ہوئے حالات نے شعر کے اسلوب، اسا[ل]یب اور پیمانوں کو بھی بدل ڈالا ہے - تبدیلی اگر حُسن، ہو تو "روح حیات" ہے، یعنی ارتقاد جکی بر "ذھن صالح" کو جستجو کرنا چاہیئے، عزیزدوست شبنم رومانی کی یہ نظم پڑھکر "نئی شاعری" کے مستقبل پر ایمان لانا ہی پڑا - نظم کے اشعار میں توازن بھی ہے، ترنم بھی، معنویت بھی ہے، مقصدیت بھی، رجز بھی ہے روانی بھی، شاعر کی حیثیت سے جانے اور پہچانے کے جویا کاش ان "توأم" الفاظ کی نظری معنویت اور ربط کو سمجھیں اور اسکی رعایت سے ان کا استعمال کریں -

(تسنیم مینائی)

آلۂ قتل پر
ہاتھ اپنا مگر،
غیر کی انگلیاں!
سرخ رُو، سرخ سر
پیرہن سرخ تر
غسلِ خون —— الاماں!
زنگ —— آئینہ گر
دنگ —— دیوار و در
گُنگ —— لفظ و بیاں!
ثبت تاریخ پر
مہرِ خونِ عمرؓ

آہ بارِ دگر
قتلِ خیبر شکن
ابنِ عفّان کا پارہ پارہ بدن
آہ بارِ دگر
ظالموں کا عَلَم
ابنِ حیدر کا سر
ہاں یہی اپنی تاریخ کے زخم ہیں
بس یہی فرد ہے اپنے اعمال کی
خیر ہو اپنے مستقبل و حال کی

سو گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را

آج روزِ وصال فانی ہے۔ "موت سے ہو رہے ہیں راز و نیاز" یہ مرحلہ بھی اگست کے مہینے ہی میں پیش آیا تھا سن عیسوی ۱۹۴۱ء یا ۱۹۴۲ء تھا۔ اگست کی رعایت سے فانی کو بھی ایک بار پھر یاد کریں جو ایک منفرد طرز کا سخنور تھا۔ امتداد وقت اور تقسیم ملک کی اٹل حقیقتوں نے اسکے نام و نشان کو دھندلا دیا اور نقد و نظر کے خود ساختہ پیمانوں کی کسوٹی پر اسکے کلام کو پرکھنے والے برخود غلط ناقدوں کی بے مغز و غیر حقیقت پسندانہ تحریروں نے اسکی "باقیات" کو باقیات السئیات میں تبدیل کر دیا — آج بھی اگر فانی — شخص و شاعر کا بے لاگ مطالعہ اور تجزیہ کیا جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ غزل کا وہ دور جسکو بجا طور پر "دورِ زریں" کہا جاتا ہے — جلال و ریاض، حسرت و وحشت، ثاقب و سیماب، ناطق و نوح، صفی و عزیز، جگر و اصغر، فراق و یگانہ، حفیظ و فیض، نشور و مجاز، روش و ماہر القادری کی رنگین بیانیوں، زمزمہ پردازیوں اور نکتہ آفرینیوں سے لازوال چراغوں کی لو سے جگمگاتا اور شیش محل KALIEDOSCOPE کا منظر پیش کرتا ہے جسمیں فانی کی روشن ہوئی شمعیں صاف پہچانی جاتی ہیں۔ اسکی ایک غزل کے پانچ شعر جو یہاں نقل کئے جاتے ہیں اسکی یاد ہی تازہ کر جائیں گے اور اسکے منفرد رنگِ سخن کا صحیح شعور بھی اجاگر کر دیں گے۔ (تسنیم مینائی)

ہم تری یاد سے غافل نہیں ہونے پاتے ⁂ کوئی چٹکی سی کلیجے میں لئے جاتا ہے

جو تری بزم میں شامل نہیں ہونے پاتے ⁂ حرم و دیر کے کوچے میں پڑے سڑتے ہیں

رُخ مگر جانبِ ساحل نہیں ہونے پاتے ⁂ موج نے ڈوبنے والوں کو نہ کیا کیا پلٹا

نقش بن جاتے ہیں منزل نہیں ہونے پاتے ⁂ تو کہاں ہے کہ تری راہ میں یہ کعبہ و دیر

خود تجلّی کو نہیں اذنِ حضوری فانی
آئینے ان کے مقابل نہیں ہونے پاتے

مرزا نسیم بیگ

ماہر نکتہ داں

ماہر القادری مرحوم کی شخصیت کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ لیکن پھر بھی بہت کچھ لکھا جانا باقی ہے۔ کیونکہ
ان کی شخصیت کے اتنے پہلو ہیں جن کا بیک وقت احاطہ کرنا مشکل ہے، وہ نقاد بھی تھے، شاعر بھی، ادیب بھی تھے اور صحا
بھی، وہ کبھی تحقیق و تجسس کے میدان میں نظر آتے تو کبھی نعت گوئی اور نعت خوانی کرتے دکھائی دیتے ہیں وہ اگر صبح سویر
کسی کتب خانے میں مطالعہ اور تحقیق کرتے نظر آتے تو رات کے وقت کسی دینی جلسے میں نعت خوانی کرتے پائے جاتے۔ وہ آخ
دم تک علم حاصل کرنے کے خواہش مند رہے اور دن رات اس کے لئے کوشاں رہتے۔ اس سلسلے میں وہ اکثر بابائے اردو مولوی عب
کا یہ قول دہراتے کہ "ریلوے کے ٹائم ٹیبل کے مطالعے سے بھی معلومات میں کچھ نہ کچھ اضافہ ہی ہوتا ہے۔" وہ علمی معاملات میں ا
قدر محتاط تھے کہ ان کی سی احتیاط کم دیکھنے میں آتی ہے۔

وہ ترقی اردو بورڈ میں اکثر تشریف لاتے اور بورڈ کی لائبریری اور ذخیرۂ اسناد سے استفادہ کے علاوہ بورڈ کے اہل
حضرات سے تبادلۂ خیال بھی کرتے رہتے۔

ماہر مرحوم کو ترقی اردو بورڈ (حال اردو ڈکشنری بورڈ) کے منصوبۂ لغت اور بورڈ کے سہ ماہی رسالے ار
نامہ سے غیر معمولی دلچسپی تھی۔ اس لئے اردو نامہ کا تازہ شمارہ آتے ہی ان کو بھیج دیا جاتا تھا۔ اس وقت اردو لغت کے اج
بھی اردو نامہ میں قسط وار شائع ہوتے تھے۔ ماہر صاحب کو جیسے ہی اردو نامہ ملتا وہ اس کا مطالعہ ایک ہی نشست میں کر ڈا
اور پورے پرچے کا جائزہ لے کر اس پر تبصرہ لکھ دیتے۔ اجزائے لغت کے بارے میں بڑی باریک بینی سے کام لیتے۔ پھر بور
دفتر میں آکر بورڈ کے سیکرٹری اور رسالے کے مدیر جناب شان الحق حقی سے اپنے جائزے کی روشنی میں تبادلۂ خیال کر
اور ہر اس لفظ کے بارے میں وضاحت طلب کرتے جس کی تذکیر و تانیث یا تشریح کے بارے میں انھیں کسی قسم کا شبہ
اختلاف ہوتا۔ ایسے موقعوں پر ان کی زبان سے اکثر یہ سنا گیا کہ دوآبہ میں یہ لفظ یوں بولا جاتا ہے اور فلاں لغت میں یہ یوں
ہے۔ آپ کی لغت میں اس بات کی بھی وضاحت ہونی چاہیئے۔ آپ کی لغت میں یہ بات بھی درج ہونی چاہیئے۔ یہ بات بھی یہ
درج ہونا چاہیئے تھی۔ یہاں اس کا عمل تضاد وغیرہ وغیرہ۔

میں ان دنوں اردو نامہ کا منیجر تھا۔ اس لئے مولانا سے اکثر سابقہ پڑتا تھا، مجھے ان کو قریب سے دیکھنے کا موقع
اور ملاقات بھی رہی۔ میرے پاس بورڈ میں ایک مرتبہ ان کا ٹیلی فون آیا اور انہوں نے یہ دریافت فرمایا کہ رانی کیتکی

پورا نام کیا ہے۔ میں نے جواب میں پورا نام بتایا تو کہنے لگے ایسے نہیں ذرا کتاب منگوا کر دیکھ کر بتایئے۔ میں نے کتاب منگوائی اور ٹائٹل پڑھ کر سُنایا اور ان کے اصرار پر دوبارہ پڑھا تو وہ کہنے لگے ذرا ٹھہریئے میں نوٹ کر لوں، اس پر میں نے پھر پڑھا اور لکھوایا۔ اس کے باوجود دوسرے روز صبح سویرے ہی وہ ترقی اردو بورڈ کے دفتر تشریف لائے اور کہنے لگے کہ کل آپ کو زحمت دی۔ لیکن میرا اطمینان نہ ہوا۔ در اصل مجھے اس کتاب کا حوالہ دینا ہے اس لئے کتاب کو خود دیکھنا چاہتا ہوں کیونکہ اس کے نام میں "کی" کی تکرار مجھے پریشان کر رہی ہے۔ پھر انہوں نے کتاب دیکھی اور حرف بہ حرف ٹائٹل نقل کر لیا۔ "کہانی رانی کیتکی اور کنور اودے بھان کی از انشاء اللہ خاں انشا دہلوی"۔

تحقیق و تدقیق کے بارے میں ان کے محتاط رویے کا کچھ اندازہ تو اس واقعے سے کیا جا سکتا ہے لیکن ان کی شخصیت کے اس پہلو کے بارے میں مزید روشنی ان مکاتیب سے پڑتی ہے۔ جو اردو بورڈ کے سہ ماہی مجلے "اردو نامہ" میں شائع ہوتے تھے۔ لہٰذا وہ خطوط آپ کی خدمت میں پیش کئے جائیں گے۔ ان کے ساتھ وہ حواشی بھی شامل ہیں جو رسالے کے مدیر شان الحق حقی صاحب نے جواباً تحریر کیے تھے یا ادارے کچھ دوسرے اصحاب نے وضاحت کے طور پر لکھے تھے، ان حاشیوں کے بارے میں خود ماہر مرحوم نے لکھا تھا کہ "آپ کے حواشی اگرچہ مختصر ہوتے ہیں مگر خوب ہوتے ہیں"۔

ان خطوں سے ماہر مرحوم کے نظریات اور اندازِ فکر کا اندازہ ہی نہیں ہوتا بلکہ ان کے شب و روز کی مصروفیات پر بھی روشنی پڑتی ہے اور اس زمانے کے اہم واقعات کا ذکر بھی ملتا ہے جن سے قارئین کی معلومات میں اضافہ ہوگا۔

(مرزا نسیم بیگ)

مراسلات

جناب مکرم

السلام علیکم

ا۔ اردو لغت کی تیسری قسط جولائی تا ستمبر کے "اردو نامہ" میں پڑھی، اور "ترقی اردو بورڈ" کی محنت، تحقیق اور دیدہ ریزی پر اس کے لئے دل سے دعائیں نکلیں۔

دو چار مقامات پر مجھے کھٹک محسوس ہوئی، طالب علمانہ حیثیت سے اس کا اظہار کر رہا ہوں، مقصود خدانخواستہ مکابرت اور طنز و تعریض نہیں بلکہ افہام و تفہیم اور اصلاح و ترقی ہے۔!

صفحہ ۴۲ — "ابرِ رحمت — خدا کا بھیجا ہوا بادل" کیا وہ بادل جو زحمت و عذاب ثابت ہوتا ہے، خدا کا بھیجا ہوا نہیں، کسی اور کا بھیجا ہوا ہوتا ہے؟ ابرِ رحمت ہو یا ابرِ عذاب دونوں قسم کے بادل خدا ہی کے بھیجے ہوئے ہوتے ہیں! "ابرِ رحمت" کی تشریح میں اس انداز کی عبارت ہونی چاہیئے۔ "ابرِ رحمت — خدا کا بھیجا ہوا بادل، جو زحمت و عذاب کی بجائے نشاط و آسودگی کا سبب بن سکے......"

صفحہ ۴۶ — "ابراہیم، سامی پیغمبر آذر کے بیٹے آر (بابل) کے باشندے تھے" ایسے "نام" جن کا املا دو طریقے سے لکھا جاتا ہے، ان کے دونوں "املا" لغت اردو میں درج ہونے چاہئیں! ہاں جو "املا" زیادہ معروف ہو، وہ اصل عبارت میں لکھا جائے اور قوسین میں وہ املا جو کم مشہور اور کم مستعمل ہے! مثلاً دلی اور دہلی دونوں لفظ لکھے جائیں گے۔

عربی کا مشہور لغت "المنجد" میرے سامنے ہے، اس میں 'آر' کی جگہ 'اُور' لکھا ہے۔ میں نے بعض دوسری کتابوں میں اس بستی کا نام 'اُور' بھی پڑھا ہے، اس لئے لغت اردو میں یوں کتابت ہونی چاہیئے: — آر (اُور)۔

راقم الحروف نے ۱۹۳۳ء میں عراق کا سفر کیا تھا، بصرہ سے بغداد ہم ٹرین کے ذریعہ روانہ ہوئے۔ رات میں بصرے سے جب ٹرین چلی ہے تو دس بج چکے تھے، صبح آٹھ بجے کے قریب "آر ریلوے جنکشن" سے ٹرین گزری، یہی بستی 'مولد ابراہیم' ہے۔ راستہ میں بابل بھی آیا، اس وقت دن کے دو ڈھائی بجے ہوں گے، اس سے اندازہ ہوا کہ "آر" بابل سے تقریباً سو میل کی مسافت پر واقع ہے۔ اس صورت میں 'آر' کے ساتھ 'بابل' قوسین میں لکھنے سے لغت دیکھنے اور پڑھنے والوں کو دھوکا ہوگا کہ "آر" شہر بابل کے قریب اس کی کوئی مضافاتی بستی ہوگی، جیسے دلی کے قریب شاہدرہ! حالانکہ مسافت و بعد کے اعتبار سے آر کا تعلق بابل سے ایسا نہیں ہے جیسا شاہدرہ کا دلی سے ہے شاہدرہ کو ہم بے شک "شاہدرہ (دلی)" لکھ سکتے ہیں، اسی طرح سکندرہ اور فتحپور سیکری کے ساتھ بھی قوسین میں — اکبر آباد — لکھا جا سکتا ہے اور لوگ لکھتے ہی ہیں مگر غازی آباد، واڑی، پلول، نجف گڑھ اور فرید آباد کے ساتھ قوسین میں دلی نہیں لکھتے، ہاں قطب صاحب اور بستی نظام الدین کے ساتھ دلی لکھتے ہیں

اگر آپ کے لغت میں 'آر' کا ایک مستقل نام اور لفظ کی حیثیت سے ذکر آئے تو وہاں اس شہر کی قدرے تفصیل کے ساتھ تاریخی حیثیت بیان کر دی جائے، ورنہ 'ابراہیم' کے ذکر کے ساتھ یوں لکھ دیا جائے۔

'سامی پیغمبر آذر کے بیٹے، (اُور) کے باشندے جو کلدانیوں کی حکومت میں شامل تھا اور بابل سے (اتنے میل کی) مسافت پر واقع ہے......'

ابرہہ یمن کے حبشی گورنر کا نام جس نے اسلام سے پہلے (چھٹی صدی کے نصف اول میں) مکہ پر ہاتھیوں کے لشکر کے ساتھ چڑھائی کی......'

یہ غلط فہمی مغربی مورخین کی پھیلائی ہوئی ہے کہ وہ نبئ آخر سیدنا محمد عربی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بعثت کو آغاز اسلام سے تعبیر کرتے ہیں اور حضور کو "بانیٔ اسلام" کہتے ہیں! قرآن کے نقطۂ نگاہ سے ہر نبی اور رسول "مسلم" تھا۔ یہاں تک کہ ابوالبشر آدم علیہ السلام بھی 'مسلم' تھے۔ اس لئے ضروری ہے کہ عبارت سے 'اسلام سے پہلے' خارج کرکے 'چھٹی صدی' کے بعد 'عیسوی' ضرور لکھ دیا جائے۔

— 'مکہ پر ہاتھیوں کے لشکر کے ساتھ چڑھائی کی' — اور 'ہاتھیوں کا لشکر لے کر مکہ پر چڑھائی کی' ان دونوں میں فصیح تر کون سا ہے! اس پر غور فرما لیا جائے۔

— 'ابعاد' کے معنی ہیں — فاصلے' دوریاں، جہاں تک میری محدود معلومات کا تعلق ہے اردو میں نزدیکی، کی جمع (نزدیکیاں) اور دوری کی جمع (دوریاں) نہیں آتی!

[ماہر القادری کراچی]

---

۲ — جناب مکرم! السلام علیکم!

ماہ جون ۱۹۷۶ء کا "اردو نامہ" ملا۔ صفحہ ۲۲۴ پر "احاطہ" کے معنی میں متعدد الفاظ دیئے گئے ہیں، یہاں تک کہ "گھیرا" بھی موجود ہے، مگر "گھیر" نہیں دیا گیا۔ یہ لفظ "گھیر" — "احاطہ" کے معنی میں لازمی طور پر آنا چاہیئے تھا۔ یو۔پی کے اضلاع میں "احاطہ" کو عام طور پر "گھیر" بولتے ہیں۔

رام پور میں وہاں کے مشہور آدمیوں کے بنائے ہوئے "احاطے" ہیں جو "گھیر" کے نام سے مشہور ہیں یہاں تک کہ ان محلوں کے نام "گھیر" ہی کے ناموں سے مشہور ہو گئے ہیں مثلاً گھیر نجو خاں۔

"احاطہ" کی تشریح کے سلسلے میں ایک اور بات بھی آنی چاہیئے تھی۔ وہ یہ کہ یو۔پی کے قصبات و دیہات میں "احاطہ" کو "حاطہ" بھی بولتے ہیں، "الف" حذف کر دیا جاتا ہے۔ چنانچہ فرہنگ آصفیہ میں اس کی صراحت موجود ہے:

"عوام بفتح الف بولتے ہیں، اور کبھی 'الف' حذف کر دیتے ہیں" (صفحہ ۱۲۲ مطبوعۂ گلزار محمدی اسٹیم پریس لاہور، سنہ 1918ء)۔

واضعین لغت کی نگاہ مطبوعہ لغات سے باہر بھی رہنی چاہیئے۔ فرہنگ آصفیہ اور نوراللغات میں "احاطہ" کے معنی میں "گھیر" نہیں لکھا گیا اس لئے آپ کے یہاں کی لغت میں بھی "گھیر" نہیں آیا۔ حیرت ہے کہ اتنے مشہور اور عوامی لفظ سے ترقی اردو بورڈ کے ارکان ناواقف ہیں! یہ اگلے واضعین لغات کی بھول چوک ہے کہ "گھیر" جیسا عوامی لفظ لکھنا ان سے رہ گیا۔ یہ کمی آپ کی مرتبہ لغت میں پوری ہو جانی چاہیئے تھی۔

نقارن

پھر "احاطہ" کا ایک عوامی تلفظ "حاطہ" (بہ حذف حرف الف) بھی ہے، اس کا ذکر "فرہنگ آصفیہ" میں کیا گیا ہے، اس عوامی تلفظ سے غالباً ترقی اردو بورڈ کے ارباب کارنا آشنا تھے، اس لئے اسے اجنبی سمجھ کر حذف کر دیا ہے۔

اس مختصر سے خط کو اپنے مجلہ میں آپ شائع فرما دیں تو مناسب ہے۔

ماہر القادری

۱۹ جولائی ۱۹۶۷ء

احاطہ کے ضمن میں "حاطہ" درج ہے جسے آپ نے شاید نظر انداز فرمایا۔ "گھیر" اپنے مقام پر گھ کے تحت درج ہوگا۔ امید ہے یہ دو باتیں آپ کے رفع حیرت کے لئے کافی ہوں گی۔ ش۔ح۔ح۔

۳۔ ۱۹ اکتوبر ۱۹۷۰ء

جناب مکرم! السلام علیکم!

اُردو نامہ (شمارہ ۳۷، جولائی تا ستمبر ۱۹۷۰ء) ملا۔ شکریہ۔ اس میں "شعبۂ لغت" کے تحت صفحہ ۱۰۷ پر یہ عبارت نظر آئی ہے "۔۔۔ درس حدیث، طب، یا پیش نمازی وغیرہ کی اجازت یا سند" اس میں لفظ "پیش نمازی" غور طلب ہے!

اُردو لغات میں بیشک نماز پڑھانے والے کو "پیش نماز" بھی لکھا گیا ہے، مگر اُردو بولنے والے مسلمانوں کی اکثریت "پیش نماز" نہیں بولتی "امام" بولتی ہے اور "پیش نمازی" یعنی نماز پڑھانے کے عمل (FUNCTION) کو "امامت" کہتی ہے! اُردو لغت میں بھی "امام" اور "امامت" کے یہی معنی لکھے ہیں۔

فقۂ اسلامی کی عربی کتابوں میں بھی نماز پڑھانے والے کو "امام" ہی لکھا گیا ہے۔ پاکستان کے محکمہ اوقاف کے تحت جو مساجد ہیں اُن میں جو لوگ نماز پڑھانے کا فریضہ انجام دیتے ہیں اُن کو "ائمہ مساجد" ہی کہا جاتا ہے۔ حیدرآباد کے محکمۂ امور مذہبی کی اصطلاح بھی "پیش نماز" نہیں "امام" ہی تھی اور وہاں سرکاری مراسلے "پیش نمازوں" کے نام سے نہیں "ائمہ مساجد" کے نام سے بھیجے جاتے تھے۔

شیعہ حضرات البتہ "پیش نماز" بجائے "امام" اور "امامت" کی جگہ "پیش نمازی" بولتے ہیں۔ اس تشریح میں:-

"درس حدیث، طب یا پیش نمازی وغیرہ کی اجازت یا سند"

کو یوں لکھیئے۔

"درس حدیث، طب یا مسجد میں نماز پڑھانے وغیرہ کی اجازت یا سند"

" درس حدیث، طب یا مسجد میں نماز پڑھانے (امامت و پیش نمازی) وغیرہ کی اجازت یا سند "
دوسری بات یہ عرض کرنی ہے کہ " امام " اور " پیش نماز " کے معنی میں یہ ضرور کہہ دینا چاہیے کہ شیعہ ...حضرات " نماز پڑھانے والے " کو " پیش نماز " اور نماز پڑھانے کی خدمت کو " پیش نمازی " بولتے ہیں باقی دوسرے فرقوں کے اُردو بولنے والے مسلمان " امام " اور " امامت " کہتے ہیں۔

والسلام
مخلص، ماہر القادری

جناب مکرم

...۴ـ تسلیم و نیاز

اُردو نامہ (شمارہ ۳۸) ملا، شکریہ، " کتاب زندگی " کی قسطیں بڑی دلچسپی کے ساتھ پڑھتا رہا ہوں، ...ب کی بار گیارہویں قسط زیادہ غور و توجہ کے ساتھ پڑھی اور اُس میں بعض باتیں کھٹکیں۔

(۱) " بارہ برس بعد کوڑی کے بھی دن پھرتے ہیں (صفحہ ۱۲۶)

اصل ضرب المثل یوں ہے :

" بارہ برس میں گھورے کے بھی دن پھرتے ہیں " (۱)

(۲) " بھانڈوں کو دوپٹے اور روپے دل کھول کر انعام دیے۔

بیاہ برات اور خوشی کی تقریبوں میں " دوپٹے " تو ڈومنیوں کو دیے جاتے ہیں، بھانڈوں اور میراثیوں کو انعام میں " دوشالے " دیے جاتے ہیں۔

(۳) " دہلی سے پھلت ضلع کھتولی گئے "۔

کھتولی تو ایک قصبہ ہے، ضلع کا صدر مقام نہیں ہے۔

(۴) " دلہن سجی سجائی " جھکی جھکائی، شرمائی لجائی، ریل کی سیٹ پر بیٹھی تھی اور سب گھونگھٹ اُٹھا اُٹھا کر دلہن کا منہ دیکھ رہے تھے۔ (صفحہ ۱۲۷)

" دلہن " کی منہ دکھائی سسرال آنے کے بعد ہوتی ہے، یہ کبھی سننے اور دیکھنے میں نہیں آیا کہ ریل کے ڈبے میں رشتہ دار دلہن کا منہ دیکھنا شروع کر دیں، جس زمانے کا یہ ذکر ہے، اُس زمانے میں مسلمان گھرانوں میں پردے کی سخت پابندی تھی، ریل کے ڈبے میں دلہن کی منہ دکھائی سے بے پردگی ہوتی (۲)۔

(۵) "ہم لوگ جب دلی سے حیدرآباد آئے تو ماموں صاحب نے اندول بلایا، خوب خوب مزے رہے
خوب بڑا مکان تھا، دلہن خوب بھی رہتی ..... مجھ سے خوب دوستی ہوگئی .... خوب سیر ہو کر
آم کھاتے (صفحہ ۱۲۷)

ٹائپ کی چار سطروں میں چھ جگہ "خوب" آیا ہے! ایسے موقعوں پر تکرار لفظی سے بچنے کے لئے دوسری صفات (خوب کے مترادف) لانی چاہیئے تھیں! (۳)

(۶) "جب بچہ ہونے کا شان و گمان بھی نہ تھا" (صفحہ ۱۲۹)۔

"شان و گمان" غلط ہے، صحیح "سان گمان" ہے: "رنگ روپ" "ہرج مرج" "سیدھا سادا" "جان پہچان" اس قسم کے لفظوں کے درمیان واؤ عطف نہیں آتا۔ پھر صحیح املا اور تلفظ "سان" (س کے ساتھ) ہے "شان" نہیں ہے! (۴)

(۷) "ماموں صاحب کے سب ہی بچے سعادت مند، متواضع اور نیک خصلت ہوئے" (صفحہ ۱۳۰)

"..... نیک خصلت نکلے" لکھنا تھا (۵)۔

(۸) "ہم نے اپنے گھر میں ایسے غصّے نہیں دیکھے" (صفحہ ۱۳۲)۔

اُردو میں "غصّہ" کی جمع نہیں آتی (۶)

(۹) "اور سب نے منہ ہاتھ دھویا" (صفحہ ۱۳۴)

"ہاتھ منہ دھویا" لکھنا چاہیئے تھا (۷)۔

صفحہ ۱۳۵ پر "مہندی" کا املا "میندہی" کیا گیا ہے اور "پندرہ" کو "پندھرہ" لکھا ہے۔

صفحہ ۱۷۶ پر "باب مراسلات" میں یہ جملہ —

"آپ کی سرفرازی کا مستوجب ہے"

عجیب ہے۔

صفحہ ۱۴۴ پر (تبصرے):—

"بعض لوگ اس امر میں مغالطہ کرتے تھے" (صفحہ ۱۴۴)۔

ممکن ہے یہ ٹائپ کی غلطی ہو — "مغالطہ کرنا" اُردو روزمرہ نہیں ہے! اُمید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا

مخلص ماہر القادری

۲۸ جنوری ۱۹۷۱ء

---

۵۵ - الف ۱/۱۷/۲ ناظم آباد نمبر ۳ کراچی
۳۱ جنوری ۱۹۷۱ء

جناب مکرم

آداب و نیاز

تین چار دن پہلے آپ کی خدمت میں نیاز نامہ بھیج چکا ہوں جو مل گیا ہوگا، اس دوسرے خط میں بعض ضروری باتیں قابل اظہار ہیں :

" امام " اور " پیش نماز " کی شرح و معنی کے سلسلے میں راقم الحروف کا جو نیاز نامہ آپ نے " اردو نامہ " میں شائع فرمایا ہے اس سلسلے میں مجھے یہ کہنا ہے کہ نماز پڑھانے (امامت) کے لئے " مسجد " کی قید نہیں ہے، مساجد سے باہر بھی جماعت کے ساتھ نماز پڑھی جاتی ہے اور اس کے پڑھانے والوں کو بھی امام، پیش امام، اور پیش نماز کہتے ہیں۔

" کتاب زندگی " کے اس جملہ پر۔

" بھانڈوں کو دوپٹے اور روپے دل کھول کر انعام دیئے "

میں نے گرفت کی تھی کہ دوپٹے ڈومنیوں اور میراثیوں کو انعام میں دیئے جاتے ہیں اور بھانڈوں، نقالوں اور میراثیوں کو دوشالے۔ اگر بھانڈوں کو دوپٹے کی وضع کا لانبا کپڑا انعام میں دیا جائے تو اُسے " دوپٹہ " نہیں " صافہ " کہتے ہیں، دوپٹہ عورتیں اوڑھتی ہیں اور " صافہ " مرد اپنے سروں سے باندھتے ہیں۔ اب وہ جملہ یوں ہونا چاہیئے۔

" بھانڈوں کو صافے (۸) اور روپے دل کھول کر انعام میں دیئے "

جس تقریب کا ذکر کیا ہے وہ خوشحال گھرانے کی تقریب ہے، اور اس میں بھانڈوں کو صافے اور روپے دیئے ہوں گے۔ نواب اور راجے مہاراجے بھانڈوں اور نقالوں کو دوشالے دیتے ہیں۔

ہاتھ منہ دھونے کے ثبوت میں مرزا داغ دہلوی کا یہ شعر لکھنے سے رہ گیا۔

ہاتھ منہ ان کا دھلایا غیر نے
ہاتھ اپنی جان سے دھوتے ہیں ہم

اسی مضمون میں ایک جملہ یہ ہے۔

" محبت بھی عجیب چیز ہے نہ کسی کے دل میں حسد نہ بغض ہے سب نہال نہال ہیں " (صفحہ ۱۳۳)

" نہال " میں خوش ہونے کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے لیکن یہ لفظ مراد پانے اور کامیاب ہونے کے معنی میں بولا جاتا ہے، محترمہ خاتون مضمون نگار نے ۔

" سب خوش ہیں "

کے معنی میں " سب نہال نہال ہیں " استعمال کیا ہے ، جو محل نظر ہے ! (۹)

" کتاب زندگی " میں پھلت کا جو ذکر آیا ہے تو پھلت ضلع مظفر نگر میں واقع ہے ، حضرت شاہ ولی اللہ
کی یہاں نانہال تھی اور وہ پھلت میں پیدا ہوئے تھے ۔ کھتولی ضلع مظفر نگر کا ایک قصبہ ہے ، خود ضلع نہیں ہے !

" مادھونل اور کام کنڈلا " پر جناب س ، م شاہ صاحب کی تنقید بہت خوب ہے ۔ صفحہ ۷۹ پر انہوں نے
ہوم (ہون) کے معنی یوں لکھے ہیں ۔

" ہندوؤں کا ایک طریق عبادت ہے جس کے معنی ہیں آتشیں قربانی "

" آتشیں قربانی " سے تو شدید قسم کی قربانی کا مفہوم نکلتا ہے ، یا یہ کہ جلتی ہوئی آگ سے گزر کر یا آگ میں بدن کا
کوئی حصہ جلا کر قربانی دی جاتی ہے ۔ حالانکہ ہوم (ہون) ہندوؤں میں نذر و منت کی ایک مذہبی رسم ہے جس میں
آگ جلا کر اُس پر گھی ڈالتے ہیں اور اشلوک (منتر) پڑھتے جاتے ہیں !

ترقی اُردو بورڈ کی مرتب کردہ لغت میں اساتذہ اور مشاہیر شاعروں اور ادیبوں کے شعروں اور تحریروں
سے سند لی جاتی ہے ، استنباط کا یہ طریقہ درست اور معقول ہے ! مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ ان حضرات سے کبھی کبھار
زبان و اظہار اور بیان میں تسامح بھی ہو جاتا ہے ۔ وہ " تسامح " سند نہیں بن سکتا ۔

شعراء کے یہاں قافیوں کی پابندی اور رعایت تسامح کا سبب بنتی ہے ۔ مثلاً آغا شاعر دہلوی جو زبان
کے مستند اُستاد ہیں ۔ وہ کہتے ہیں :

کھلے پھول سبزے لہکنے لگے ٭ گلستاں میں بلبل چہکنے لگے

اُردو میں " سبزہ " (بہ معنی ہریالی) کی جمع نہیں آتی ، قافیے کو نباہنے کے لئے اُن سے تسامح ہو گیا ۔ اسی طرح
مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم نے " ستوپیا " لکھا ہے ، حالانکہ " ستو " ہر حالت میں جمع بولا جاتا ہے (اُس نے ستو پئے)

میر تقی میر کی غزل کا مطلع ہے :

جہاں پہلے بہاریں ہو گئی ہیں ٭ وہاں اب خار زاریں ہو گئی ہیں

اس میں " ہو گئی ہیں " سے سند لی جائے گی ، مصرعہ اولیٰ میں " ہو گئی ہیں " سے مراد ہے بہاریں آ کر چلی گئی ہیں
یا بہاروں کا پھیرا ہو چکا ہے ، مصرعہ ثانی میں " ہو گئی ہیں " کا مفہوم ہے " پیدا ہو گئی ہیں " یا " اگ آئی ہیں "
" خار زاریں " میر کے دور میں (مؤنث) بولتے ہوں گے ۔ مگر اب " خار زار " " مرغزار " " سبزہ زار " بالاتفاق
مذکر بولے جاتے ہیں ، اس لئے میر کے اس شعر میں خار زار کی جو جمع (خار زاریں) استعمال ہوئی ہے وہ قابل استناد
نہیں ہے ! خار زار کی جمع " خار زاروں " ہے ۔

سرسید احمد خاں نے " املی کا انگریز" تحریر فرمایا ہے۔ علامہ شبلی نعمانی نے " پیکان" کو مونث لکھا ہے، حالانکہ "پیکان" مذکر ہے، مولانا عبدالحلیم شررنے " لطف" کی جمع " لطفوں" استعمال کی ہے، اردو میں لطف کی جمع (لطفوں) نہیں آتی۔ سید ناصر نذیر فراق کے قلم سے " نوکریں" نکل گیا۔ " نوکر" کا مونث " نوکرانی" ہے اور اُس کی جمع " نوکریں" نہیں " نوکرانیاں" ہے، نوکر مذکر ہے اُس کی جمع " نوکروں" آتی ہے۔

اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ خدانخواستہ ہمارے اکابر شعراء اور اہلِ قلم غلط نگار تھے۔ یہ حضرات تو زبان و ادب کے محسن ہیں اور اُن کا لکھا ہوا اور فرمایا ہوا سند ہے۔ مقصد گذارش یہ ہے کہ ان کے " تسامحات" سند نہیں بن سکتے۔ ان تسامحات پر مطلع ہونا یہ مرتبین کے مطالعے ذہانت و فراست، زبان دانی اور ذوق و وجدان پر منحصر ہے"۔

مخلص ماہر القادری

(۱) کوڑی بھی درست ہے۔

" مثل ہے کبھی کوڑی کے دن بھی پھرتے ہیں"۔ قصص الامثال، ص ۲۷

(۲) منہ دکھائی کی رسم علیحدہ چیز ہے، یہاں صرف منہ دیکھنے کا ذکر ہے۔

(۳) یہاں انداز بیان زیادہ بے ساختہ ہے۔ یہی مضمون کی ساری خوبی ہے۔ لفظ بدل بدل کرلانے سے تصنع پیدا ہوتا ہے۔

(۴) "شان وگمان" کی مثالیں ادب میں بہت عام ہیں۔ گفتگو میں بیشک " سان گمان" زیادہ رائج تھا۔

" حیرت خیز زلزلے بے شان وگمان واقع ہوتے ہیں"۔ تاریخ تمدن ص ۲۷۲

" ایسی پست ہمتی تو کسی کے شان وگمان میں نہ تھی"۔ چنگیز (ڈرامہ) ص ۶۸

" لیکن اس کا شان وگمان بھی باقی نہیں"۔ مضامین حیرت ص ۹۰

" سارے گھر میں کسی کو بیٹے کا شان گمان تک بھی نہ تھا"۔ (بلاعطف) محصنات ص ۷

" خدا نے مجھ عاجز پر وہ فضل کیا کہ جس کا مجھے یا دوسرے کو شان گمان بھی نہ تھا (مکرر بلاعطف مگر ش کے ساتھ)"

" جس کا ان میں سے کسی کو شان گمان بھی نہ تھا"۔ (ایضاً) مقدمات عبدالحق (۲) ص ۱۷۲

" شان وگمان کی بہت مثالیں ہیں:

ان آیات میں قیدیوں کے قتل کا کہیں شان وگمان بھی نہیں پایا جاتا۔ رسائل چراغ علی (۱) ص ۴۵

" بستیاں کی بستیاں ایسی تاراج ہو جاتیں کہ جن میں ہست و بود کا سان وگمان بھی کبھی نہ ہو"۔
آغا شاعر۔ خمارستان ص ۲۱

(۵) ہونے میں کوئی لغوی یا محاورے کی غلطی نہیں۔
(۶) دیکھیے یہیں آگئی۔ جمع تو مزاج کی بھی آتی ہے، بلکہ فصیح ہے۔
(۷) دونوں طرح مستعمل ہے۔
(۸) صافے کو بھی دوپٹہ کہتے ہیں اور کمر کے پٹکے کو بھی، اس کے لغوی معنی "دو پاٹ کی چادر لغات میں مذکور ہیں
(۹) نہال کے یہ معنی از روئے لغات درست ہیں اور مانوس بھی۔
(۱۰) تاریخی لغت میں مثال اور حوالے کے ساتھ قدیم و جدید دونوں طرح کا استعمال درج کرنا لازمی ہے۔ ان میں وہ الفاظ بھی ضرور آئیں گے جو متروک ہو چکے۔ مثال اور حوالے سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ کون سا لفظ کب رائج تھا۔ شعر میں لفظ پرکھ کر رکھا جاتا ہے۔ میر کو اس غلطی پر ان کے سامع ضرور ٹوکتے، لیکن انہوں نے یہ شعر دیوان سے خارج نہیں کیا۔ معلوم ہوا کہ "خار زار" جو اب مذکر ہے پہلے مؤنث بھی بولا جاتا تھا۔ ش۔ ع

۶ــ: ۱۱ اکتوبر ۱۹۷۱ء

جناب مکرم

ماہ ستمبر ۷۱ء کا "اردو نامہ" ملا، شکریہ! میں نے اس سے پہلے بھی عرض کیا تھا کہ مشاہیر اہل قلم ہوں یا اساتذہ (شعرا) بعض اوقات مفہوم ادا کرنے میں اُن سے بھی محاورے اور روزمرّہ کی غلطی ہو جاتی ہے، ان کی یہ غلطیاں اور تصرفات و تسامحات سند نہیں بن سکتے!

اس شمارے کے صفحہ ۷ اور ۸ پر آغا شاعر دہلوی کی عبارت کا ایک ٹکڑا ہے:

"حاضرین ہر شعر کو غور سے سماعت فرماتے ہیں اور مناسب موقع پر اپنی اپنی رائے کے پرتو سے لقمہ بھی دیتے جاتے ہیں"

"رائے کا پرتو" کیا ہوتا ہے؟ مفہوم تو سمجھ میں آ گیا مگر اس طرح کون بولتا ہے؟ یہ تو وہ تکلف یا تصرف ہے جو ذوق و وجدان کو کھٹکتا ہے۔ (۱)

"پھر شورش ہوئی ـــ" (صفحہ ۸۰) آغا شاعر نے یہ لفظ (شورش) داد و تحسین کے شور کے معنی میں استعمال کیا ہے، جو درست نہیں ہے، صفحہ ۸۱ پر انہوں نے "حلمی بھر دائی" لکھا ہے، صحیح املا "ہامی" ہے اور اس لفظ کو حائے حطی کے ساتھ لکھنا غلط ہے۔ (۲)

"جب شمع ادھر ڈھلی تو سب صاحبوں نے نہایت چمک دمک سے غزلیں پڑھیں" (صفحہ ۸۲)

"شمع ادھر ڈھلی" سے شاید یہ مراد ہے کہ مشاعرے میں جب "شمع ان کے سامنے رکھی گئی"۔ مگر یہ محاورہ سننے اور پڑھنے میں نہیں آیا، اس قسم کے تصرفات کی پوری تحقیق کرنی چاہیئے! (۳)

مولانا احسن مارہروی لکھتے ہیں :

" اپنے فرق مبارک کو دو تین کاوے یا جھٹکے دے کر " جی یا جی " کی تکرار فرمانے لگے ۔ " (صفحہ ۸۶)

دکن میں " جی ہاں " کے لئے " جی ہا " " نہیں " جی ہو " بولتے ہیں ! اسی صفحہ پر " حیدر آبادی جمبیا " کے معنی قوسین میں " چھری " لکھے ہیں ، جو درست نہیں ہے ۔ " جمبیا " ایک قسم کا " خنجر " ہوتا ہے ! (۴)

" والہ موسوی " پر جو مضمون ہے اس کے صفحہ ۹۶ پر " منصب بھی عطا کی تھی " یہ ٹائپ کی غلطی معلوم ہوتی ہے " منصب " تو بالاتفاق مذکر ہے ۔

محترمہ قیصری بیگم کے مضمون میں بھی بعض الفاظ کھٹکے :۔

" ارے گلے ملنے سے کیا ہوتا ہے ، کلیجے میں گھس جاتے " (صفحہ ۱۱۶)

" کلیجے میں گھس جاتے " سے غالباً یہ مراد ہو کہ " دل میں گھر کر لیتے "

" دل سے قریب ہو جاتے " ! یہ اگر قدیم اردو روز مرہ ہے تو ہر لحاظ سے عجیب ہے ! اور محترمہ کا تصرف یا ایجاد ہے تو ناگوار تصرف اور نا قابل قبول ایجاد ہے ! (۵)

" ایک دن عزت سے بہت روئی تھی " (صفحہ ۱۱۷) اور " خوب انتہا سے دودھ پیا " (صفحہ ۱۱۸)

دونوں جملوں میں " سے " کا استعمال محل نظر ہے ! (۶)

" بیٹی بڑی پیاری ہے ، بڑی اچھی ہے ، بچی کا دل کسی طرح قابو میں نہیں آتا " (صفحہ ۱۱۷)

" بچی کا دل کسی طرح قابو میں نہیں آتا " اس جگہ یوں ہوتا ۔۔

" اور بچی ہے کہ کسی طرح چپ ہی نہیں ہوتی " تو مفہوم کی مناسب و موزوں ترجمانی ہوتی !

اس سے آگے عبارت یہ ہے ۔۔

" سب نے کہا اور ہورے ان کی عزت ، بھلا ان کو کیا خبر کہ چوٹا کسے کہتے ہیں "

بچی کے لئے " ان " کی ضمیر عجیب سی لگتی ہے ! (۸) پھر صحیح املا " چونٹی " ہے ۔ اسی طرح چور کے معنی میں " چوٹا " نہیں " چوٹٹا " املا کیا جاتا ہے ۔ (۹)

جناب ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ نے راقم الحروف کو یہ مشورہ دیا ہے کہ ۔۔

" وہ آئندہ اپنے انتقاد کو زبان اور محاورہ کی اصلاح تک محدود رکھیں " نکتہ چینی برائے نکتہ چینی " کا طریقہ پسندیدہ نہیں کہا جا سکتا ۔ " (صفحہ ۱۵۴)

اس سلسلہ میں عرض ہے کہ بعض اوقات بچپن یا آغاز جوانی کی باتیں ٹھیک طرح یاد نہیں رہتیں ، خود مجھ سے پچاس سال قبل کے بعض واقعات کے بیان میں سہو ہو گیا ہے !

کوئی مضمون نگار ستر اسی (۷۰ – ۸۰) برس پہلے کے واقعات بیان کرتے ہوئے یوں لکھے کہ ۔ ۔ ۔ فلاں گھرانے میں ایک عورت کو میں نے سگرٹ پیتے ہوئے دیکھا" یا غدر ۱۸۵۷ء کے زمانے میں کسی ہندوستانی خاندان میں چائے پینے کا ذکر کیا جائے، تو اس قسم کے واقعات پر تنقید کی جائے گی جس کو "تکذیب" نہیں کہہ سکتے۔ واقعات عام تمدن، عرف عام اور رسم و رواج کے مطابق ہونے چاہئیں۔ (۱۰)

"پلیٹس" کی ڈکشنری کے بارے میں راقم الحروف نے یہ نہیں کہا تھا کہ اس میں سرے سے کوئی غلطی ہی نہیں پائی جاتی۔ ہاں میں نے یہ ضرور لکھا تھا کہ اس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔" ترقی اردو بورڈ" کے دانشمندوں کی خدمت میں خاکسار نے یہی گذارش کی ہے کہ وہ قدیم ڈکشنریاں ہوں یا نثر و نظم کی کتابیں ان سے پوری تحقیق کے ساتھ استفادہ اور استناد کریں، مگر ان کے تسامحات اور غلطیوں سے بچیں اور ان کی پیروی نہ کریں اور بے عیب اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، انسانوں کے کاموں میں تھوڑی بہت کور کسر رہ ہی جاتی ہے۔

"پلیٹس" کی ڈکشنری میں ایسے الفاظ میری نظر سے گذرے جو دوسری "لغات" میں نہیں ملتے۔ اس شخص (JOHN. T. PLATTS) نے الفاظ کی تحقیق میں جو محنت و کاوش کی ہے اس کا ہمیں کھلے دل سے اعتراف کرنا چاہیئے۔ پلیٹس نے اتنی جامع لغت مدون کر کے اردو دنیا پر بلاشبہ احسان کیا ہے۔

ہم بچپن سے کوڑیوں اور گولیوں سے کھیلا کرتے تھے اور جب حساب کتاب برابر ہو جاتا تھا یعنی کسی ساتھی کے ذمے کوئی چیز (کوڑی، گولی، گیڑی وغیرہ) باقی نہیں رہتی تھی، تو اس کو "اوتل پاتل" کہتے تھے، پلیٹس میں یہ لفظ مل گیا، مگر اس کا املا "اوتر پاتر" کیا گیا ہے اور معنی یوں لکھے ہیں۔

DISPOSED OF CLEARED DISCHARGED, SETTLED, PAID OFF, BALANCED
(AS ACCOUNTS)

"پلیٹس" کی بات مانی جائے گی صحیح املا "اوتر پاتر" ہی ہو گا مگر گاؤں والے جس طرح "دیوار" کو "دیوال" بولتے ہیں، اسی طرح وہ "اوتر پاتر" کا تلفظ "اوتل پاتل" کرتے ہیں۔

جناب صادقین کی رباعیوں کی کتاب کی ۱۴ اکتوبر کو آرٹ کونسل میں جو نمائش ہوئی تھی، وہاں آپ سے نیاز حاصل ہوا تھا! جہاں تک مصوری کا تعلق ہے یہ اپنے ذوق و شرب کی چیز ہی نہیں ہے! ہاں! یہ بات صادقین صاحب کی قدرت کلام اور مشاقی کا زندہ ثبوت ہے کہ انہوں نے سال سوا سال کی مدت میں دو ہزار رباعیاں کہی ہیں۔ یہ خاصی جان دار رباعیاں ہیں اور یہ ان کا کارنامہ ہے!

آرٹ کونسل سے واپس ہوا تو ایک رباعی ہو گئی۔

ہو فکر حسیں، نگاہ غائر ہو جائے ٭ بے تابیٔ دل زباں سے ظاہر ہو جائے

الفاظ میں ڈھل جائے تصور کا سکوت ٭ معراج مصور کی ہے شاعر ہو جائے

ہاں! "لغت" کا نام تجویز کرنے کے سلسلے میں ترقی اُردو بورڈ کا جو مشاورتی جلسہ ہوا تھا، میں نے اس "لغت" کا نام "اُردو فرہنگ" تجویز کیا تھا اور غالباً آپ کو خط بھی لکھا تھا۔

امید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گے

والسلام

مخلص، ماہر القادری

(۱) یہ شاید "پرتا" ہے۔

(۲) یہ اشتقاق کا معاملہ ہے اور شاید آپ کی رائے صحیح ہے۔

(۳) ڈھلنا کا استعمال غلط نہیں، ذوقی اختلاف ہو سکتا ہے۔

(۴) دکنی لفظ نہ "ھا" ہے نہ "ھو" بلکہ دونوں کے درمیان۔

(۵) افسوس کہ آپ نے اس بے ساختہ فقرے کی داد نہ دی، یہ ایک کیفیت کا اظہار ہے۔ جسے وہی لوگ محسوس کر سکتے ہیں جو ۱۲، ۱۴ برس بعد اپنے بچھڑے ہوئے بیٹوں سے ملے تھے۔

(۶) "سے" دونوں جگہ فصیح ہے۔

(۷) بہت فصیح جملہ ہے ترمیم کی ضرورت نہیں۔

(۸) یہ ضمیر غیر معمولی ہی سمجھ کر لکھی گئی ہے، کیونکہ بچی نے بڑوں کا سا انداز اختیار کیا تھا۔

(۹) اردو املا میں 'چوتا'، کی مثالیں اور جواز موجود ہے، ویسے املا ابھی تک معیاری نہیں بن سکا

(۱۰) قیصری بیگم صاحبہ نے ایسی کوئی بات نہیں لکھی۔

(۱۱) ہم واضعین نہیں، جامعین لغت ہیں۔ شان الحق حقی

۷:۔ مکرمی و محترمی

سلام و رحمت

تازہ ترین "اُردو نامہ" ملا، اس کے مضامین نہ صرف یہ کہ شوق و دلچسپی کے ساتھ پڑھے بلکہ ان سے استفادہ کیا۔ یہ جان کر مسرت ہوئی کہ قاضی اختر میاں جونا گڑھی اور آپ کے مضامین و مقالات کے مجموعے کتابی شکل میں شائع ہو رہے ہیں۔ قاضی اختر میاں مرحوم کے علمی مضامین تو مجلہ "معارف" (اعظم گڑھ) میں ۱۹۳۰ء سے پڑھتا رہا ہوں۔ نگران سے ملاقات کا شرف بمبئی میں حاصل ہوا، یہ ۱۹۴۵ء کی بات ہے۔ میں بزم اقبال کے "کل ہند مشاعرے" کے سلسلے میں بمبئی گیا ہوا تھا۔ کرافرڈ مارکیٹ کے قریب ایک تاجر کے یہاں قاضی صاحب

ٹھہرے ہوئے تھے۔ ان صاحب کا نام تو یاد نہیں رہا، ہاں اتنا یاد ہے وہ انڈے مرغی کے بیوپاری تھے۔ قاضی اختر میاں کے ایماء پر ان کے میزبان نے مجھے کھانے پر مدعو کیا۔ ذائقہ دار کھانے، اس کے بعد شاعر کو داد و تحسین بھی مل جائے، پھر اور کیا چاہیئے۔ قاضی صاحب مرحوم سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔

پاکستان آنے کے بعد کراچی میں قاضی اختر میاں سے ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں۔ وہ شریف النفس تھے، وسیع المطالعہ تھے اور اردو، انگریزی، فارسی، عربی اور گجراتی پانچوں زبانوں کے انشا پرداز تھے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ دین و اخلاق ان کی گھٹی میں پڑا تھا۔ صوم و صلوٰۃ کے انتہائی پابند۔ صاعد اندلسی کی "طبقات الامم" کا قاضی اختر میاں مرحوم نے کتنا شستہ ترجمہ کیا ہے اور اس پر جو حواشی لکھے ہیں، وہ ان کی محققانہ بصیرت اور علمی کاوش کا زندہ ثبوت ہیں۔

"اردو نامہ" میں راقم الحروف کا جو خط شائع ہوا ہے، اس میں اہل دکن کے "جی ھو" کے سلسلے میں آپ نے فٹ نوٹ میں لکھا ہے:

دکنی لفظ نہ "ھا" ہے اور نہ "ھو" بلکہ دونوں کے درمیان۔

کراچی میں ہزاروں مہاجرین دکن موجود ہیں، ان کا لہجہ سن کر آپ فیصلہ فرما سکتے ہیں کہ وہ "جی ہو" کا تلفظ "ہوکا" اور "ہول" کی طرح کرتے ہیں۔

"کتاب زندگی"، صفحہ ۱۷۷ پر "کھچڑی" کو "کھچڑی" پڑھنا پڑا (۱) یہ ٹائپ کی غلطی معلوم ہوتی ہے اور "ساچق" کا املا "سانچق" کیا گیا ہے، ممکن ہے دلی کی عورتیں "ساچق" کو "سانچق" بولتی ہوں، یہ بھی تحقیق طلب ہے۔ ایسے مقامات پر حاشیے میں لفظ کا صحیح اور عمومی املا درج کر دینا ضروری ہے۔

محترمہ قیصری بیگم صاحبہ نے لکھا ہے ۱۹۱۱ء کے ایڈورڈ ہفتم کے دربار دہلی کے موقعے پر انہوں نے نواب میر عثمان علی خاں بہادر نظام دکن کی سواری دیکھی تھی، ایڈورڈ ہفتم ۱۸۷۵ء میں پرنس آف ویلز کی حیثیت سے ہندوستان آئے اور ملکہ وکٹوریہ کے مرنے کے بعد ۱۹۰۱ء میں تخت نشین ہوئے اور ۱۹۱۰ء میں فوت ہو گئے۔ جس دربار کا ذکر قیصری بیگم صاحبہ نے کیا ہے وہ ۱۹۱۱ء میں جارج پنجم کی تاجپوشی کا دربار تھا جو دلی میں شاہانہ کروفر کے ساتھ منعقد ہوا تھا اور اسی دربار میں نواب میر عثمان علی خاں شریک ہوئے تھے۔ (۲)

شفقت کاظمی صاحب کی غزل میں "جدائیاں" پڑھ کر کھٹک پیدا ہوئی، فارسی میں "جدائی"، کی جمع آتی ہے اور ممکن ہے کہ اردو کے قدیم شاعروں میں سے بھی کسی نے "جدائیاں" نظم کیا ہو مگر عام طور پر اردو میں "جدائی" کی جمع نہ بولتے ہیں اور نہ لکھتے ہیں۔ (۳)

فرقت، شجاعت، لحاظ، تلون، اضطرار، صحت، برودت۔ (عربی الفاظ) نزدیکی، خستگی، بے کسی، دانش،

خاک ۔ (فارسی الفاظ) دھرتی، آگ، مٹی، پھرتی، چلبلاہٹ، بچھاؤ، بوہوتری، لبھاؤ، صفایا، ہوکا، ادلا بدلا، چہل پہل، کھٹ پٹ ۔ (اردو الفاظ) کی جمع اردو میں نہیں بولی جاتی ۔

میں اپنے خطوں میں پلیٹس (PLATTS) کی ڈکشنری کی تعریف کر چکا ہوں، اس ڈکشنری کو جب بھی دیکھنے کا اتفاق ہوتا ہے، معلومات میں اضافہ ہوجاتا ہے، مثلاً :

شب کوری (NIGHT-BLINDNESS — NYCTALOPIA) کو اردو میں "رتوند" کہتے ہیں اور جو کوئی رتوند یعنی شب کوری کا مریض ہوتا ہے، اسے "رتوندیا" کہا جاتا ہے، مگر "نور اللغات" میں "رتوندھا" اور "رتوندھیا" لکھا ہوا ملا ۔ غالباً اودھ اور پوربی اضلاع میں یہ لفظ "ھائے مخلوط" کے ساتھ بولا جاتا اور لکھا جاتا ہے، لیکن دوآبہ کے اضلاع میں "ھائے مخلوط" کے بغیر بولتے اور لکھتے ہیں ۔ باباۓ اردو مولوی عبدالحق کی مرتب کی ہوئی انگلش اردو ڈکشنری میں بھی "رتوندا" لکھا ہوا ملا، مگر پلیٹس کی تحقیق کو صد آفریں اس نے "رتوندا" اور "رتوندھا" دونوں طرح املا کیا ہے ۔

"ترقیٔ اردو بورڈ" کی زیر ترتیب لغت کا نام کیا تجویز ہوا ؟

مخلص، ماہر القادری

حواشی ۔

(۱) آپ کا گمان صحیح ہے ۔

(۲) بیشک یہاں سہو ہوا ہے ۔

(۳) بے دیکھے جن کے دم میں آنکھیں بھر آنیاں ہوں ÷ کیا قہر ہے کہ ان سے برسوں جدائیاں ہوں (سودا)

ترے وصال کے ہم شوق میں ہو آوارہ ÷ عزیز دوست سبھوں کی جدائیاں دیکھیں (میر)

غالباً یہ اشعار آپ کے اطمینان کے لئے کافی ہوں گے ۔

شان الحق حقی ۔

---

۸ ۔ کراچی، ۲۸ جون ۷۶ ۱۹ء

جناب مکرم و محترم

السلام علیکم

تازہ ترین اُردو نامہ ملا، شکریہ ! دو نشستوں میں قریب قریب تمام مضامین پڑھ ڈالے ۔ مضامین کی ترتیب و انتخاب کا سلیقہ تبریک و تحسین کا مستحق ہے !

مطالعے سے معلومات میں اضافہ ہوتا ہے، باباۓ اُردو مولوی عبدالحق کہا کرتے تھے کہ ریلوے ٹائم ٹیبل پڑھنے سے بھی نئی باتیں معلوم ہوتی ہیں ! علمی مسائل میں کامل تبحّر کا دعویٰ کون کر سکتا ہے، الفاظ کی تحقیق میں خود

راقم الحروف کو اپنی معلومات کی کوتاہی و بے خبری کا احساس ہوتا رہتا ہے! علم کے دریا کا نہ تو اور چھور ملتا ہے، اور نہ تھاہ!

"کتاب زندگی" کی ہر قسط بڑی دلچسپی کے ساتھ پڑھتا ہوں، اس میں واقعات زندگی، مناظر اور لکھنے والی کے ذاتی واردات و احساسات کے علاوہ زبان، روزمرہ اور محاوروں کا چٹخارہ ملتا ہے۔ مگر کہیں کہیں کھٹک بھی محسوس ہوتی ہے۔

"فرش فروش اور برتن بھانڈا" (صفحہ ۴۵) "برتن بھانڈے" کا محل تھا۔

"یہاں تک کہ لوٹوں میں پانی، صابن دانی تک رکھ دی (صفحہ ۴۵) ان دونوں جملوں کے درمیان "اور" ضرور آنا چاہیئے تھا یوں۔ "یہاں تک کہ لوٹوں میں پانی اور صابن دانی تک رکھ دی" (۱)

"آپ اپنے پلنگ پر لحاف اوڑھے گرم لیٹے لیٹے ہوئے تھے" (صفحہ ۴۷) "گرم" کا استعمال اس جملے میں ٹھیک طور پر نہیں ہوا، محترمہ یہ کہنا چاہتی ہیں کہ "اُن کا بدن گرم تھا" اس مفہوم کے اظہار میں نقص رہ گیا ہے۔ "لیٹے" کی تکرار محل غور ہے۔ (۲)

"اور درگاہ حضرت خواجہ باقی باللہ رحمتہ اللہ علیہ میں آرام فرما ہوئے" (صفحہ ۴۷) "آرام فرما ہوئے" سے تو ایسا لگتا ہے کہ مرحوم اپنے ارادے سے درگاہ خواجہ باقی باللہ میں دفن ہوئے! (۳)

"کپڑے، جرط وال ..." (صفحہ ۴۸) جاڑے میں جو گرم کپڑے پہنے جاتے ہیں۔ اُن کو "جرط وال" نہیں "جرداول" کہتے ہیں، ہو سکتا ہے کہ یہ ٹائپ کی غلطی ہو۔ (۴)

"..... بیماری تو چل ہی چکی تھی" (صفحہ ۴۹) یہ ٹکڑا عبارت میں کھٹکتا ہے۔ اس میں بیماری کے ساتھ "چل ہی چکی تھی" محل نظر ہے! (۵)

"جیسے کسی نے ہزار ہا برقی یا گیس کے گولے روشن کر دیئے ہوں" (صفحہ ۵۰) گیس کے ساتھ "ہنڈے" بولا جاتا ہے، یوں ہوتا: (۶)

"جیسے کسی نے ہزار ہا برقی لیمپ یا گیس کے ہنڈے روشن کر دیئے ہوں"

"دونوں وہاں کے دل کش سمے ..." (صفحہ ۵۵) یہ ٹکڑا بھی عجیب سا ہے! (۷)

"طشت چوکی لگوانا گوارہ نہ کیا" (صفحہ ۵۵) زیادہ صحیح املا "گوارا" ہے۔ پلیٹس نے "گوارہ" کو "GARWARA" لکھا ہے۔ (۸)

"جس دن انھیں بیہوشی طاری ہونے لگی تھی" (صفحہ ۵۵) "انھیں" کی بجائے "اُن پر" لکھنا تھا۔ (۸)

"بھائی ہنس دیتے، لیکن کیسی ہنسی؟ رونکھی" (صفحہ ۵۶) عام طور پر "روکھی" لکھا اور بولا جاتا ہے! (۹)۔

" جب ڈاکٹرنی آئی تھی ہیں بے حد خوش آئی " (صفحہ ۵۶) اس جملہ کا آخری حصہ عجیب ہے ! (۱۰)

" ... میں اماں کی چاہیتی تھی " (صفحہ ۵۸) " چاہیتی " غلط نہیں ہے ۔ مگر اب اس لفظ کا املا اور تلفظ " چہیتی " کیا جاتا ہے ! (۱۱)

" بہت سی بیویاں آئیں " (صفحہ ۶۰) دلی میں " بیبیوں " کے معنی میں " بیویاں " بولا جاتا ہے ! حالانکہ " بیوی " اُس عورت کو کہتے ہیں جس کی شادی ہو چکی ہو ! شادی شدہ عورتوں کے ساتھ کنواری لڑکیاں بھی ہوں تو اُن کو " بیویاں " کہتے ہوئے وجدان و ذوق ناگواری محسوس کرتے ہیں ! بی بیاں (بیبیاں) شریف عورتوں کو کہتے ہیں اور ان میں بیاہی عورتیں ، بیوائیں اور کنواری لڑکیاں سب شامل ہیں !

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بیبیاں [1] ؏ اکبر زمیں میں غیرتِ قومی سے گڑ گیا

حضرت اکبر الٰہ آبادی نے " بیویاں " نہیں " بیبیاں " باندھا ہے اور یہی اس لفظ کا صحیح استعمال ہے ۔ (۱۲)

" اپنے متعلق کشمکش سے میں نہیں جانتی تھی کہ ہنسی کیا چیز ہے " (صفحہ ۶۰) " کشمکش " نے پورے جملہ کو کاواک بنا دیا ۔ (۱۳)

" وہ انہوں نے حرّاج میں خریدے تھے " (صفحہ ۶۵) حیدر آباد میں نیلام کو " حراج " نہیں " ہرّاج " بولتے اور لکھتے ہیں ! (۱۴)

" اپنی چھوٹی ملازمت پر مگن رہتے (صفحہ ۶۷) " پر " کا نہیں " میں " کا موقع تھا ۔ (۱۵)

بعض مقامات پر انداز بیان کمزور بھی ہے ! زبان و بیان اور اظہار میں اتنی مشاقی کے بعد عبارتوں میں کہیں کہیں جھول بھی ہے ! (۱۶) زبان و روزمرہ کا مسئلہ بڑا نازک ہے ، بڑے بڑوں کی ٹھیک نکل جاتی ہے ۔ راقم الحروف اپنی گزشتہ تحریروں کو دیکھتا ہے تو اُن میں خامیاں نظر آتی ہیں ! بھول چوک سے کوئی انسان محفوظ نہیں ہے یا مشاہیر کی غلطیاں سند نہیں بن سکتیں !

والسلام

مخلص ، ماہر القادری

حاشیہ :

اس زمانے میں جب کہ زبان کے معاملے میں ہر طرف آزادہ روی کا رجحان ملتا ہے ، جناب ماہر القادری کی اس باریک بینی سے کام لینا جو انہوں نے بالخصوص محترمہ قیصری بیگم صاحبہ کی خود نوشت سرگزشت کی بابت اختیار کی ہے ، ایک طرح کی قدر افزائی ہے ۔ جس قسم کی نکتہ چینی اس تحریر پر کی گئی ، اسی شمارے کے بعض دوسرے مضامین پر شاید زیادہ آسانی کے ساتھ کی جا سکتی تھی ۔ بہر حال یہ سرگزشت ایک گھریلو یادداشت کے

---

[1] : مجھے یہ مصرعہ اسی طرح یاد ہے ! (م ۔ ق)

طور پر بے تکلفانہ انداز میں لکھی گئی ہے، اسے ادب یا زبان دانی کا چیلنج بنا کر پیش نہیں کیا گیا، جس کا جواب لازم آ
اتفاق سے یہی بے تکلفانہ سیدھا سادا، اور صنعت گری سے مبرّا انداز تحریر اس کی خصوصیت بن گیا ہے۔

محترمہ کی عمر اب ۸۰ سال کے لگ بھگ ہے، اور جب یہ سرگزشت لکھی گئی تب بھی ستر سے متجاوز تھیں
انہوں نے اسے لکھ کر محض رکھ چھوڑا تھا، اس کا کوئی جزو بھی اشاعت کے لیے پیش نہیں کیا، چھاپنے کے گناہ
ہم ہیں، اور تنقید کے جواب دہی بھی ہم پر لازم آتی ہے کہ بعض جگہ محض طباعت کی غلطیاں واقع ہوئی ہیں،
جیسا کہ ذیل میں واضح کیا جاتا ہے:

(۱) بیشک "برتن بھانڈے" ہی ہے۔ اسی طرح لفظ "اور" آپ چاہیں تو عبارت میں ضرور بڑھا لیں۔

(۲) "لیٹے لیٹے تھے"، صریحاً سہو طباعت ہے۔ لیکن "گرم گرم لیٹے تھے"، عین مطابق محاورہ ہے۔ "لحاف کے اندر ان کا بدن گرم تھا" اصلاح نہیں، نہ اس طرح بولا جاتا ہے۔

(۳) زبان کے معاملے میں منطق کو اس قدر دخل نہیں ہوتا۔ ورنہ "انتقال فرمایا" بھی غلط ہونا چاہیئے یوں کہا جائے کہ "دار فانی سے عالم بقا کو منتقل کر دیئے گئے!"

(۴، ۵) اطراف دہلی اور لکھنؤ کے اہل زبان یا زباں داں جو اعتراض دوسرے علاقوں کی اردو پر کرتے آئے تھے کہ گویا ان لوگوں نے اردو ابھی نہیں سیکھی، ویسے ہی کچھ اعتراض مولانا نے قیصری بیگم کی زبان پر کئے ہیں۔ گویا موصوفہ نے بھی اردو ابھی اچھی طرح نہیں سیکھی۔ بظاہر اس میں کوئی غلطی نہیں کہ "بیماری تو چل ہی چکی تھی"۔ یہ اور بات کہ مولانا خود اس بات کو کسی اور طرح ادا کرنا پسند کریں، یعنی کسی محاورے یا لغت کے سہارے۔

(۶) جملہ درست ہے۔ "برقی یا گیس کے" ایک ساتھ کہا جائے تو صرف گولے کہنے میں مضائقہ نہیں۔

(۷) اس کا کیا جواب دیا جا سکتا ہے کہ "یہ ٹکڑا عجیب سا ہے"۔ "عجیب" علم بلاغت کی کوئی اصلاح نہیں۔

(۸) اس کے لئے ہم جناب مصنفہ اور مولانا دونوں سے معذرت خواہ ہیں۔

(۹) پھیکی ہنسی اور چیز ہے، "روکھی" اور۔ اس کیفیت پر نظر رکھیں جس کا اظہار مقصود ہے۔

(۱۰) "خوشی ہوئی" کو "خوشی آئی" پڑھنے پر اتنا اصرار ضروری نہیں تھا۔

(۱۱) قیصری بیگم نے اور جگہ "چہیتی" بھی لکھا ہے، دونوں صحیح ہیں۔

(۱۲) گویا یہ اعتراض دلّی کی زبان پر ہے مصنفہ پر نہیں۔

(۱۳) جدید نثر میں محذوفات ELLIPSES کا استعمال اس قدر عام ہے کہ جس جملے کو مولانا نے کاواک بتایا دراصل معنی خیز اور دلچسپ ہو جاتا ہے۔ یہاں داد انشا دینے کی کوشش نہیں کی گئی۔ بلکہ سچی سچی وار دات قلبی دوہرائی جا رہی ہیں، وہ بھی اپنے آپ سے۔

(۱۶) لکھنے کی بات الگ رہی، یہ خوب فرمایا ہے کہ "حراج" نہیں "ہراج"، بولتے ہیں۔ کیا واقعی لوگ مخارج میں ایسا ہی امتیاز قائم رکھتے ہیں؟ اتفاق سے اصل لفظ "حراج" ہی ہے۔ مصنفہ نے ٹھیک لکھا ہے۔

(۱۷) "ملازمت پر ہونا" اور "حال میں مگن رہنا" یہ دو باتیں ایک جملہ میں کہی گئی ہیں۔ یہ بڑا مرغوب اختصار ہے۔

(۱۸) مولانا نے ان بندھے ہوئے تنقیدی جملوں کا غلط جگہ اطلاق فرمایا ہے۔ یہ باتیں کسی شاعر عزّا یا چوٹی کے انشاپرداز CONSCIOUS ARTIST کی بابت کہی جاتیں تو شاید برمحل ہوتیں، جیسے کہ مولانا خود یا جناب جوش ملیح آبادی۔ "بڑے بڑوں کی ٹھیک نکل جاتی ہے"، یہ فصیح البیانی مولانا کا طرز نگارش ہے، مصنّفہ نے اس کا بیڑا نہیں اُٹھایا۔ مولانا کا یہ دعویٰ بھی کہ "مشاہیر کی غلطیاں سند نہیں بن سکتیں" اگرچہ یہاں بے محل ہے مگر تاریخی رو سے غلط ٹھہرتا ہے۔ مشاہیر کا کیا ذکر عوام کی لسانی غلطیاں بھی اکثر فصاحت کا درجہ پالیتی ہیں۔ محض "صحتِ کلام" پر انحصار ہوتا تو آج اُردو کا وجود بھی نہ ہوتا کہ اُردو سراسر تغیرات اور اجتہادات کی بدولت وجود میں آئی ہے اور آج اتنے لُغات سے مالا مال ہے۔

ش۔ ح۔ ح۔

ماہنامہ فاران
ناظم آباد، کراچی

جناب مکرم

سلام و رحمت

تازہ ترین "اُردو نامہ" سلا۔ اس کے مضامین سے استفادہ کیا۔ آپ کے حواشی اگرچہ مختصر ہوتے ہیں۔ مگر خوب ہوتے ہیں۔ کار سرکاری کے ہجوم میں مطالعہ و تحقیق کے لئے آپ جتنا بھی وقت نکال لیتے ہیں وہ بڑی بات ہے۔ پھر بھی جہاں تک بشری سہو و ذھول کا تعلق ہے، اس سے نہ آپ محفوظ ہیں اور نہ میں! علمی اور لسانی بحث و گفتگو سے نقصان کے فائدہ ہی ہوتا ہے۔ معلومات میں اضافہ اور ایسی باتوں کا انکشاف اور اکتشاف ہوتا ہے جس سے ذہن و حافظہ بے دار ہوتے ہیں۔

"اردو نامہ" کی حیثیت یہ ہے کہ وہ "ترقی اُردو بورڈ" کا آرگن ہے۔ اس میں چھپے ہوئے مضامین بڑی حیثیت اور وقعت رکھتے ہیں، ان سے استناد کیا جا سکتا ہے، اس لئے اس کے مضامین پڑھتے ہوئے جو باتیں وجدان و ذوق کو کھٹکتی ہیں عرض کر دیتا ہوں!

اردو کی وسعت و ترقی کے معاملے میں راقم الحروف تنگ نظر نہیں ہے۔ میں تو "فوق البھڑک" اور "لب سڑک"

کو بھی اس لئے درست سمجھتا ہوں کہ یہ "غلط العام" بن چکے ہیں۔ اسی طرح عربی، فارسی، انگریزی اور ہندی الفاظ میں اردو بولنے والوں کا جو تلفظ ہے، وہی میرے نزدیک درست ہے۔ مثلاً اردو کے "نمونہ" (ن بالفتح) کو "نمونہ" (ن پیش کے ساتھ) اور "بینڈ" کو "بینڈ" (زیر کے ساتھ) بولنا خوش ذوقی نہیں ہے۔

میرے خیال میں ادب صرف "ابلاغ" کا نہیں "حسنِ ابلاغ" کا نام ہے۔ شعر و ادب میں سارا کھیل لفظوں کے صحیح استعمال کا ہے۔ اس میں مشاہیر سے سہو بھی ہو جاتا ہے اور وہ "سہو" چاہے اس کا ارتکاب میر تقی میر نے اور سر سید احمد خاں ہی نے کیوں نہ کیا ہو، سند نہیں بن سکتا۔ اس لئے نقد و احتساب میں بڑی باریک بینی کی ضرورت ہے ادبی ذوق و وجدان کو نازک و حساس بھی ہونا چاہیئے۔

جہاں استاد فصیح الملک نواب مرزا داغ دہلوی سب کے نزدیک سند ہیں۔ مگر "نوادر داغ" میں صفحہ ۱۲ پر ان کا ایک مصرع درج ہے

ہم مر گئے دنیا کی ہر آفات سے چھوٹے

جمع کے ساتھ اردو میں "ہر" نہیں "ساری" "سارے" یا "تمام" آتا ہے۔

ان کانوں نے آج تک "درود" کو مونث نہ سنا اور نہ ان آنکھوں نے پڑھا مگر "اردو نامے" کے صفحہ ۴۴ پر مرقوم ہے کہ داغ نے درود کو مونث لکھا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا داغ نے غلطی کی ہے، ان کا شعر ہے۔:

کیا قبر ناتواں کی ترے بے نمود ہے ؎ افسوس فاتحہ ہے نہ جس پر درود ہے (۱)

میں نے ملا واحدی صاحب سے استفسار کیا تو جواب آیا کہ دلی والوں کو درود مونث بولتے میں نے سنا تھا، تابش دہلوی سے پوچھا تو انہوں نے درود کو مذکر بتایا، اس سے اندازہ ہوا کہ خود دلی والوں کے نزدیک درود کی تذکیر و تانیث مختلف فیہ ہے۔ میر انیس نے درود کو مذکر باندھا ہے۔:

سوتے میں شغل طاعت رب و دود تھا ؎ دل میں خدا کی یاد تھی لب پہ درود تھا

اردو بولنے والوں کی غالب اکثریت درود کو مذکر بولتی ہے بلکہ بقول صاحب نور اللغات درود کی تذکیر کو ترجیح حاصل ہے "ترقیٔ اردو بورڈ" کی لغت میں یہ لفظ (درود) اسی صراحت کے ساتھ آنا چاہیئے۔

صفحہ ۴۰ پر داغ کا ایک شعر ہے:

یاد آتے ہیں وہ اشخاص مصاحب منزل ؎ دو گھڑی جلسہ وہ احباب کے شامل اپنا

داغ کے زمانے میں "شامل" ساتھ اور ہمراہ و معیت کے معنی میں بولا جاتا تھا مگر اب متروک ہے، ہاں! صوبۂ بہار میں "شامل" ان معنی میں اب بھی بولا جاتا ہے۔

"اس کے شامل دری اور بدھنا بھی ہے"، "آنسوؤں کے ساتھ لہو بھی شامل آیا۔"

صفحہ ۷۴ پر جگر مراد آبادی کی نظم :

"ایک شاعر کا پیام، ایک مغرب زدہ کے نام"

...ر حاشیے میں لکھا ہے :

"راقم الحروف کے خیال میں یہ نظم جوش یا مجاز کے نام لکھی گئی ہوگی۔"

...لکھی گئی ہوگی نہیں"! جوش ملیح آبادی ہی سے اس نظم میں خطاب ہے اور یوں طنز و تنقید کی یہ ٹوپی جس کے سر پر ...ھی فٹ آجائے! جگر مرحوم کے اس شعر :

تو جہاں آج سے پہلے تھا وہیں آج بھی ہے ؎ دیکھ! رندان خوش انفاس کہاں تک پہنچے

...میں بھی جوش صاحب ہی کی جانب روئے سخن ہے! (۲)

صفحہ ۵۵ پر "جگر کی نظم گوئی" کے سلسلے میں یہ بات لکھی گئی ہے :

"تیسری نظم "سراپا" ہے جس میں انہوں نے اپنے محبوب (راقم کے خیال میں وحیدن بیگم) کے حسن کی تعریف ...کی ہے، فرماتے ہیں :

وہ حسن کافر اللہ اکبر ؎ تخریب دوراں آشوب محشر

ڈاکٹر محمد اسلام صاحب کا یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ ۱۹۵۲ء یا ۱۹۵۳ء میں ڈھاکے کے مشاعرے کے لئے ایک طرح دی ...گئی، جگر صاحب نے غزل کے بجائے نظم (سراپا) کہی، جناب فضل احمد کریم فضلی ان دنوں مشرقی پاکستان میں محکمۂ ...تعلیمات کے سیکرٹری تھے۔ جگر انھی کے یہاں ٹھہرے ہوئے تھے، میں بھی اس مشاعرے میں شریک ہوا۔

اس مقالے میں حضرت جگر کی نظم "قحط بنگال" کا بھی ذکر آیا ہے، یہ نظم انہوں نے بمبئی میں کہی تھی، جگر اور ...راقم الحروف حکیم حیدر بیگ دہلوی مرحوم کے یہاں مقیم تھے۔ جب وہ نظم کہہ رہے تھے تو انہوں نے اپنا یہ شعر مجھے سنایا :

اخلاق کا جلتا ہوا گھر دیکھ رہا ہوں ؎ دیکھا نہیں جاتا ہے مگر دیکھ رہا ہوں

...مگر یہ نہ سرقہ ہے اور نہ توارد ہے، جو شاعر بھی اس زمین میں غزل یا نظم کہے گا وہ یہ مصرع کہے بغیر نہیں رہ سکتا۔

محترمہ قیصری بیگم نے "سانچق" لکھا تھا، میں نے عرض کیا صحیح املا "ساچق" ہے، اسی شمارے میں جناب ...محمد طفیل کے خط سے اسکی مزید تصدیق ہوگئی کہ اصل لفظ "ساچق" ہی ہے۔ اس سلسلے میں اتنا اور عرض کر دوں کہ ترکی ...میں "ساچق" کی "چ" پر "کسرہ" ہے بروزن "سابق"! مگر اردو بولنے والوں نے جس طرح "بابر" کے پیش ...کو "زیر" سے بدل کر بابَر بنا لیا اسی طرح وہ "ساچق" (چ پر فتحہ بروزن مطلق، برحق) بولتے ہیں۔

"کتاب زندگی" میں صفحہ ۷۳ پر یہ فقرہ نظر آیا :

"سب کو آدھ آدھ سیر جواری دی"

محترمہ قیصری بیگم برسوں دکن میں رہی ہیں اس لئے ان کے قلم سے "جوار" کی جگہ "جواری" نکل گیا۔ دلی
لکھنؤ، دوآبے اور دوسرے اردو بولنے والے علاقوں میں "جوار" بولا جاتا ہے۔ "مرچ" میں بھی اہلِ دکن نے ی
کا اضافہ کرکے "مرچی" بنا دیا۔

"ایک دن میں ان کے محل میں گئی" (صفحہ ۷۳)

نواب تلاوت جنگ مرحوم سے راقم الحروف کی بھی ملاقات تھی، ان کے یہاں کھانا کھانے کا بھی اتفاق ہوا۔
ان دنوں غالباً صرف خاص مبارک کے صدر المہام تھے! نواب تلاوت جنگ کی چھوٹی سی جاگیر تھی، ان کا مکان "محل"
نہ تھا، ہاں! اسے ڈیوڑھی کہا جاتا تھا! سر آسماں جاہ بہادر دکن کی سب سے بڑی پائگاہ کے مالک تھے اور
اقربائے سرکار میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ ان کا عالی شان مکان بھی محل نہیں ڈیوڑھی کہلاتا تھا۔

"سب مل کر دلی سوار ہوئے"

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ "دلی" کے بعد "کیلئے" یا "جانے کے لئے" ٹانپ میں چھوٹ گیا۔ (۳)

"جب دلی میں انہوں نے ایک گیت سنا"

"رسیا" کو گیت بھی کہہ سکتے ہیں مگر بہتر یہ تھا کہ اسے "رسیا" ہی لکھا جاتا، اس وزن میں جو گیت کہے جاتے ہیں
ان کا نام "رسیا" ہے۔ [۱]

"کانٹا لاگو رے دیوریا ! موسے سنگ چلا نہ جائے"

موسے سنگ چلا نہ جائے، موسے گیل (ساتھ) چلا نہ جائے (صفحہ ۸۰) تینوں جگہ "چلا نا جائے" [۲] کی جگہ
"چلا نہ جائے" اصلاح کیا گیا ہے! "گیل" کے معنی ساتھ کے بھی ہیں مگر اس رسیا میں "گیل" راستے کے معنی میں
باندھا ہے! یو۔پی کے دیہات میں اب بھی راستے کے معنی میں "گیل" بولا جاتا ہے۔

"حکیم بھورے خاں بہت ہی با اخلاق، لاطمع انسان تھے۔" (صفحہ ۸۰)

"بے طمع" لکھنا تھا (۴) "بے عذر آنا اور لاخطا علاج کرنا" (صفحہ ۸۰) "لاخطا علاج" اس عبارت میں
اکھڑا اکھڑا سا لگتا ہے۔ "تیر بہ ہدف" کا محل تھا۔

"سارا گھر بخاروں میں مبتلا" (صفحہ ۸۱)

انفلوئنزا کے لئے جمع (بخاروں) لانے کی کیا ضرورت تھی۔

---

[۱] ایک اور مشہور "رسیا" کے شروع کے بول
ارجی (عرضی) دیورا سے دلوا دوں گی تونے میرا جُبنا (جوبن) لوٹا

[۲] نہ اور نہیں (NOT) کے معنی میں "نا" اور "ناں" دونوں طرح لکھتے ہیں!

دکن میں نیلام کے معنی میں "ہراج" بولتے ہیں (ر پر تشدید کے ساتھ)۔ نیلام گھر (AUCTION HALL) کو "ہراج خانہ" کہتے ہیں۔ محترمہ نے "حراج" لکھا۔ راقم الحروف نے اس پر گرفت کی! تازہ ترین اُردو نامہ میں ۸۶ پر موصوفہ نے "ہراج" ہی املا کیا ہے۔ (۵) عربی میں نیلام کے معنی میں جو "حراج" ہے۔ اس کی "ر" پر تشدید نہیں ہے یعنی "صرّاف اور درّاج" کے وزن پر نہیں ہے! "ہرّاج" یہ اہل دکن کا وضع کیا ہوا لفظ ہے اور اسے "ح" سے لکھنا درست نہیں، اور اس کی "ر" مشدد ہے!

"اس کے بعد دکن میں کال آیا" (صفحہ ۹۱)

"کال پڑا" یا "قحط پڑا" بولنے اور لکھنے کا رواج ہے۔ (۶) ہندی میں "کال" موت اور موت کے فرشتے کو بھی کہتے ہیں! نور اللغات میں "کال آنا" کے معنی "موت آنا" "وقت آنا" لکھے ہیں۔ اس لحاظ سے "کال آیا" قحط پڑنے کے معنی میں غلط استعمال ہوا ہے۔

آپ نے صفحہ ۹۸ پر لکھا ہے:

"پھیکی ہنسی اور چیز ہے، رونکھی" اور! اس کیفیت پر نظر رکھیں جس کا اظہار مقصود ہے"۔

راقم الحروف نے ہنسی کی کیفیت پر نہیں "رونکھی" کے املا پر گرفت کی تھی یہ کہ اس لفظ کا صحیح املا "روکھی" (ن کے بغیر) ہے! (۷)

"ارامل ــــ مساکین اور رنڈوے (جن کی بیویاں مرگئی ہوں) (صفحہ ۶۵۵) مگر غیاث اللغات میں "ارامل" کے معنی "زنان بیوہ" کے بھی لکھے ہیں! اردو عربی ڈکشنری بیان اللسان (مولفہ قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی) سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ "ارمل" رنڈوے کو کہتے ہیں اور "ارملہ" رانڈ (بیوہ عورت) کو! لیکن "ارمل" اور "ارملہ" دونوں کی جمع "ارامل" بھی آتی ہے "ایتام و ارامل" اردو میں کہیں آتا ہے تو اس سے یتیم بچے اور بیوہ عورتیں مراد ہوتی ہیں۔ (۸)

صفحہ ۶۵۷ پر "ارباب باطن" کے معنی یہ لکھے ہیں:

"روحانی تصرف رکھنے والے ... جو اسباب ظاہر کی پابندی سے آزاد ہوتے ہیں"۔

یہ تعریف "نظر ثانی" کی محتاج ہے۔ پہلی بات یہ کھٹکی کہ "اسباب" کے ساتھ "پابندی" نہیں آتا۔ اس طرح کون بولتا ہے۔ میں اسباب کا یا اسباب ظاہر کا پابند نہیں ہوں۔ غالباً کہنا یہ مقصود ہے کہ ارباب باطن ظواہر شریعت کی پابندی سے آزاد ہوتے ہیں۔ کوئی شخص خواہ وہ معرفت کے کسی درجے پر بھی فائز کیوں نہ ہو شریعت کے قوانین سے مستثنٰی نہیں ہے۔ ارباب باطن کی تعریف اس انداز میں کی جاسکتی ہے۔

"ارباب باطن ــــ اہل دل، صاحبان حال، جو ہر شے کے مغز، معنی اور باطن پر نظر رکھتے ہیں اور

راہ معرفت کے سالک ہوتے ہیں اور روحانیت سے شغف رکھتے ہیں"۔

صفحہ ۱۰۳ پر فاضل زیدی صاحب لکھتے ہیں:

"گھایل کو قابل و مایل کے قافیے میں میر سے لے کر ناسخ و آتش وغیرہ تک باندھا کئے مگر فصحائے حال نے پہان بین کی، کسرے کو فتحہ سے بدل دیا۔ امیر، تسلیم، داغ وغیرہ جملہ شعراء اس کے پابند ہیں"۔

مگر سہولت و وسعت اس میں ہے کہ قافیہ کی ضرورت اور حرکت کی رعایت سے گھایل کو قاتل اور آنچل دونوں طرح نظم کیا جائے جس طرح مندر کی "د" پر سنسکرت میں زیر یعنی "ای" کی ماترا ہے مگر اردو میں "مندر" بروزن "ساحر و شاطر" اور بروزن "اختر و ابتر" (مندر۔ "د" پر فتحہ) ہر دو حرکتوں (زیر و زبر) کے ساتھ بولنے اور قافیے میں لانے کا رواج ہے۔ یہی صورت "کٹھن" کی ہے، اسے بھی "رہن" "لگن" "بدن" اور "دن"، جن، بن" (بغیر) کے قافیوں کے ساتھ بہ حالت کسرہ و فتحہ نظم کر سکتے ہیں اسی طرح ہندی سال کے ساتویں مہینے "کاتک" کو (ت کے زیر اور زبر کے ساتھ) "صحنک"، "بالک" اور "سالک و ناسک" دونوں طرح قافیے میں باندھ سکتے ہیں۔

صفحہ ۱۶۶ پر ارت (ارتھ) کے معنی:

"مفہوم، معنی، مطلب، بیان"

تحریر کئے گئے ہیں۔ پلیٹس نے اس لفظ کے ۳۵ معنی دیئے ہیں۔ اُردو کی عام بول چال یوں ہے:

"تمہارا نوکر کسی ارتھ (یا ارت) کا نہیں" "آپ نے جو کاغذ بھیجا تھا وہ کسی ارتھ کا نہ نکلا"

ان دونوں جملوں میں "ارتھ" (ارت) کے منفی معنی ہیں۔ "نکما"، بے کار، غیر فائدہ مند اور ناکارہ۔

راقم الحروف کی گزارش یہ ہے کہ ارت (ارتھ) کے (مثبت) معنی "کار آمد" فائدہ مند، کام کی چیز" کے بھی ہیں۔ لہذا اس لفظ کے معنی میں "کار آمد، فائدہ مند"۔۔۔ جیسے الفاظ ضرور آنے چاہئیں۔

۳۰ اکتوبر، ۱۹۷۲ء خیر اندیش۔ ماہر القادری

حواشی

(۱) اس مصرعے سے درود کی تذکیر و تانیث ظاہر نہیں ہوتی۔ لیکن دلی میں درود کو ہمیشہ مذکر ہی سنا۔

(۲) شعر میں ایسی بات کسی کی طرف منسوب کی جائے تو وہ شعر نہیں رہتا، محض پھبتی ہو جاتی ہے۔

(۳) بول چال میں یوں بھی ہے کہ "دلی سوار ہوئے۔" کوئی لفظ چھوٹا نہیں ہے۔

(۴) لاطمع یا بے طمع کوئی بندھے ہوئے کلمے نہیں۔ اس لحاظ سے لاطمع کو فوقیت ہے کیونکہ یہاں دونوں اجزا عربی ہیں۔

(۵) یہ ٹائپ کی غلطی تھی ، قیصری بیگم کیسے تصحیح کر سکتی ہیں جب کہ وہ حیدر آباد دکن میں ہیں اور مسودہ برسوں پہلے مجلس ملا تھا۔

(۶) کال پڑنا بھی محاورہ ہے ، لیکن "کال آیا" لغتاً غلط نہیں۔

(۷) یہ گمان نہ تھا کہ آپ نے رونکھی کو بروزن روکھی پڑھا ہے۔ یہ لفظ رہالسنی کے وزن پر ہے اور اس کا ہم معنی ن پر زبر ہے ، کھ پر تشدید۔

(۸) یہ ارل اور ارملہ دونوں کی جمع ہے ، اس لئے زنانِ بیوہ اور رنڈوے دونوں کے لئے استعمال ہو سکتا ہے ، اضافہ کر دیا گیا۔ شکریہ۔

(ش۔ح۔ح)

۱۰۔ مکرمی و محترمی

تسلیم و نیاز !

تازہ ترین اردو نامہ ملا ، جس کے مطالعے سے مستفید ہوا۔ تحقیقی اور علمی مضامین میں افسانوں اور ناولوں سے زیادہ لطف آتا ہے۔

راقم الحروف کے نیاز نامے پر جو حواشی آپ کے ہیں ، اس سلسلے میں عرض پرداز ہوں کہ مرزا داغ دہلوی نے "درود" کو مونث نظم کیا ہے :

کیا قبر ناتواں کی ترے بے نمود ہے ؂ افسوس فاتحہ ہے نہ جس کی (۱) درود ہے

یہ شعر نقل کرتے ہوئے خود مجھ سے چوک ہو گئی کہ "جس کی درود" کی جگہ "جس پر درود" قلم سے نکل گیا۔ داغ کا ایک اور شعر ہے :

برسوں پڑھی ہے حضرت داؤد پر درود ؂ جب آ گیا ہے داغ کوئی خوبرو پسند

آپ نے ٹھیک لکھا ہے کہ "... دلی میں درود کو ہمیشہ مذکر ہی سنا" مگر داغ نے اس لفظ کو "مونث" نظم کیا ہے اب یہ یا تو داغ کا تسامح ہے یا پھر لغت میں اس کی صراحت یوں ہونی چاہیئے کہ "درود" کو اردو بولنے والوں کی اکثریت غالب مذکر بولتی ہے۔ نواب واجد علی شاہ اختر نے بھی درود کو مونث باندھا ہے۔ :

قلم گنگ ہے اس کے اوصاف میں ؂ درودیں پڑھے گی پری قاف میں

مگر میر انیس نے اس لفظ (درود) کو مذکر نظم کیا ہے۔

آپ کے حاشیے کو پڑھ کر میری معلومات میں اضافہ ہوا کہ دلی میں "رہالنا" کے معنی میں "رونکھا اور

رونکھی " بولا جاتا ہے ۔ یہ لفظ راقم الحروف کے کانوں نے کبھی سنا اور نہ آنکھوں نے کہیں پڑھا ۔ اس لئے میں سمجھا کہ " رونکھی ہنسی " کو " رونکھی ہنسی " لکھا گیا ہے جس میں حرف " ن " زائد ہے ۔ یہ میری بے خبری تھی ۔ مگر پلیٹس اور نوراللغات میں اس لفظ کا املا " رنکھا " کیا گیا ہے ۔ محترمہ قیصری بیگم اور آپ نے واؤ کے ساتھ (رونکھی) املا فرمایا ہے ۔ یہ لفظ لکھنؤ میں بھی نہیں بولا جاتا ، صاحب نوراللغات نے اسے دہلی والوں کی زبان کا لفظ بتایا ہے ، اور داغ کا شعر مثال میں پیش کیا ہے ، اس میں " رنکی " لکھا ہے

پھول ہنستے ہیں ہماری قبر پر ٭ کیوں رنکی شمع تربت ہو گئی

سند دلی اور لکھنؤ کی زبان ہے اور ہم اسی خوان نعمت کے زلہ ربا ہیں مگر " بدھنا " کی طرح " رونکھا رنکھا " بھی ان چند الفاظ میں شامل ہے ، جو اہل دلی کے علاوہ دوسرے اردو بولنے والے علاقوں میں رائج اور مقبول نہیں ہوا

" لاطمع " کے سلسلے میں عرض ہے کہ یہ ترکیب غلط نہیں ہے مگر فصیح تر اور سلیس و رواں بلکہ روزمرہ " بے طمع " ہے ۔ حیرت ہے کہ آپ نے " لاطمع " کو اس بنیاد پر فوقیت دی ہے کہ یہ دونوں اجزا عربی ہیں ۔ تو پھر " بے اثر " ، " بے عقل " اور " بے ضمیر " کے بارے میں کیا رائے ہے ؟ کیا ان میں بھی " بے " کی جگہ " لا " بولا اور لکھا کریں ۔ " بے " اور " لا " کے استعمال میں بڑا نازک فرق پایا جاتا ہے ۔ اس کا بہت کچھ تعلق ذوق صحیح ، وجدان اور عام استعمال و رواج سے ہے : (۴)

" یہ مرض لا علاج ہے "

اس کے یہ معنی ہیں کہ اس مرض کا علاج نہیں ہو سکتا ،

" وہ بے علاج رہا "

اس کے معنی ہیں اس شخص کا علاج اور دوا دارو نہیں ہوئی ۔ اسی طرح " بے شعور " اور " لاشعور " میں جو فرق ہے اسے ہر کوئی جانتا ہے ۔

ڈاکٹر عبدالستار صدیقی مرحوم نے جو یہ لکھا ہے :

" کتّا کی تانیث کتّی ہے ، کتیا تصغیر ہے کتّی کی "

(صفحہ ۲۱ ، اردو نامہ شمارہ ۴۴)

خاصہ محل نظر ہے : " کتّی " عام طور پر نہیں بولا جاتا " کتے " کی تانیث " کتیا " ہے اور " کتیا " ہی عوام و خواص بولتے ہیں ۔ اردو کی مشہور کہاوت ہے ؛

" کتیا اور جلیبی (یا جلیبیوں) کی رکھوالی "

جس طرح "باندی" کی تصغیر "بندوڑ" ہے، ٹھیک اسی طرح "کنی" کی تصغیر "کتیا" نہیں ہے (۵)

اسی صفحہ پر مرحوم لکھتے ہیں:

(انگیا، بے شک انگ سے ہے، لیکن "انگا" (انگرکھا) کی تصغیر اور تانیث ہے"

جس طرح "کرتے" کی تصغیر "کرتی" ہے "انگیا" کی یہ صورت نہیں ہے۔ "انگرکھے" کی ایک ہئیت اور وضع یہ بھی ہے کہ سینے کی ایک طرف کی چھاتی کھلی رہتی ہے۔ مگر "انگیا" وضع، قطع، ہئیت اور حجم میں انگرکھے سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ "انگیا" میں عورت کی چھاتیاں چھپی ہوتی ہیں! ہاں! نمایاں ہوتی ہیں اور انگیا کے ان حصوں کو "کٹوریاں" کہتے ہیں۔ پلیٹس "انگیا" کے معنی میں لکھتا ہے:

"A SHORT UNDER JACKET WORN BY women — bodice —"

"انگیا" انگرکھے کی تصغیر نہیں ہے، اس کی اصل "انگ" درست ہے، بدن کے معنی ہیں۔

ڈاکٹر صاحب مرحوم فرماتے ہیں:

"دست خط اب کون بولتا ہے؟ اب تو دستخط ہے" (صفحہ ۲۶)

لکھے پڑھے آدمی آج بھی زیادہ تر "دست خط" ہی بولتے ہیں۔ ہاں! "دست خط" کا تلفظ "دستخط" بھی روزمرہ میں شامل ہو گیا۔

ڈاکٹر شوکت سبزواری مرحوم نے لکھا ہے:

"ججمان ۔ میزبان کے معنوں میں" (صفحہ ۲۶)

سنسکرت یا پراکرت اور اپبھرنش میں "ججمان" کے معنی "میزبان" کے ہوں گے لیکن اردو میں یہ "تعظیمی لقب" ہے! اور نائی، کہار، بھاٹ اور ڈوم ڈھاڑی ان لوگوں کو جن سے انعام ملنے کی توقع ہوتی ہے اسکو، "ججمان" کہتے ہیں۔ ایک کہاوت کے اصل الفاظ یاد نہیں رہے، اس کا مفہوم اپنے لفظوں میں لکھتا ہوں:

"نائی رے نائی بال کتنے ہیں؟ نائی جواب دیتا ہے، ججمان! سامنے ہی آئے جاتے ہیں"

قصبوں اور گاؤں میں جن کو "کمین" کہا جاتا ہے ان کے مقابلے میں جو لوگ اونچی ذات کے اور کھاتے پیتے ہوتے ہیں، اور شادی بیاہ وغیرہ تقریبات پر "کمینوں" کو انعام دیتے ہیں ان کو "ججمان" کہا جاتا ہے۔ ہندو رجواڑوں میں راجاؤں کو بھی تعظیماً "ججمان" کہہ کر مخاطب کرتے تھے

"بکسا ۔ یہ بکسنا سے مشتق ہے، جس کے معنی ہیں ایسا گل سڑ جانا کہ ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے"
(صفحہ ۵۰)

"بکسنا" کے معنی ہیں:

«کلی کھلنا، مسکرانا، تبسم کرنا، خوش ہونا، کملانا، پژمردہ ہونا، مرجھانا، گلوں یا درختوں کا افسردہ ہونا، شکستہ خاطر ہونا۔ (فرہنگ آصفیہ)»

مگر «نور اللغات» میں «بکسنا» کے معنی میں «گلنا سڑنا» بھی لکھا ہے، جو غلط ہے۔ «گلی سڑی ہوئی چیز» کو «بکسی ہوئی» نہیں بولتے۔ غالباً نور اللغات ہی صاحب مکتوب کے تسامح کی بنیاد ٹھہری۔ «بکسنا» میں «گلنے سڑنے» کا مفہوم پنہاں نہیں ہے۔ (۶)

ڈاکٹر عبدالستار صدیقی مرحوم نے «گھٹا» کے معنی یوں لکھے ہیں:

«پانو پر اکثر جوتے کی رگڑ سے کھال سخت ہو کر گتھی بندھ جاتی ہے» (صفحہ ۷۰)

مگر یہ بھی تو لکھنا تھا کہ نمازوں میں سجدہ کرتے ہوئے بار بار کی رگڑ سے ماتھے پر بھی «گھٹا» پڑ جاتا ہے! چکی پیستے ہوئے ہاتھوں میں بھی گھٹے پڑ جاتے ہیں! (۷)

«اڈیٹھ» کتب لغات میں نہیں ملتا، «ڈیٹھ» نظر، نگاہ، بینائی۔ اس لئے «اڈیٹھ» نابینا(۱)، بے نگاہ، کم نظر ہوگا۔ (صفحہ ۷۴)

راقم الحروف نے بچپن میں یہ لفظ سنا تھا، کاربنکل (CARBUNCLE) کے معنی ہیں، جو عام طور پر پیٹھ میں نکلتا ہے اور اپنی خاصیت میں «سرطان» سے ملتا جلتا ہوتا ہے۔ (۸)

«کنتھا» کے سلسلے میں بھی ڈاکٹر عبدالستار صدیقی مرحوم نے لکھا ہے — نہیں ملا (میرا خیال ہے یہ کنٹھا ہوگا)

راقم الحروف نے یہ لفظ حیدر آباد دکن میں سنا۔ نواب اعظم جاہ بہادر مرحوم (ولی عہد نظام دکن) کے ایما پر ان کے ماموں نواب قدرت نواز جنگ بہادر مجھے «بلاوسٹا» لے گئے۔ پاکستان بننے سے قبل اسی عمارت (بلاوسٹا) میں ولی عہد بہادر رہتے تھے۔ نواب قدرت نواز جنگ ولی عہد بہادر کے ماموں تھے مگر بھانجے کو «سرکار» کہہ کر خطاب کرتے، وہ بولے:

«سرکار! یہ (ماہر) بڑی مشکل سے ہاتھ آئے ہیں، زیادہ تر مشاعروں میں باہر رہتے ہیں اور شہر میں بھی دعوتوں اور جلسوں میں ان کی مصروفیات رہتی ہیں»

نواب اعظم جاہ بہادر نے اس پر فرمایا:

«مجھے معلوم ہے ان لوگوں کا یہی کنتھا رہتا ہے»

اس فقرے کی روشنی میں اس لفظ (کنتھا) کے معنی کی شرح کرنی پڑے گی! جھمیلا، معاملہ، مصروفیت، کاروبار

(۱) ڈاکٹر صاحب مرحوم کا قیاس کس قدر عجیب ہے (ماہر)

خواجہ حمید الدین صاحب شاہد سے اس لفظ کے بارے میں رجوع فرمایا جائے۔ (۹)

غلام ربانی عزیز صاحب کا مقالہ ناصر علی سرہندی پر ہے، انہوں نے نتائج الافکار کے حوالہ سے عجیب بات لکھی ہے:

"جب سیف خاں مرگیا تو ناصر علی الہ آباد سے سرہند واپس چلا آیا، ایک دن شہر سے باہر ایک باغ میں چند ہم مشرب احباب کے ساتھ شراب نوشی میں مشغول تھا حضرت مجدد صاحب کا وہاں سے گزر ہوا .... (صفحہ ۹۱)

ناصر علی سرہندی کا سنہ پیدائش ۱۶۳۸ء ہے اور حضرت مجدد الف ثانی، ناصر علی کی پیدائش سے چودہ برس پہلے ۱۶۲۴ء میں وفات پا چکے تھے۔ یہ بات تو تھوڑی معلومات رکھنے والے لوگ بھی جانتے ہیں کہ حضرت مجدد صاحب عہد جہانگیری کے بزرگ ہیں اور ناصر علی سرہندی عالمگیری عہد کا شاعر ہے۔ یہ دونوں ہم عصر کس طرح ہو سکتے ہیں۔

خواجہ محمد معصوم فرزند حضرت مجدد الف ثانی سے البتہ ناصر علی سرہندی عقیدت و ارادت رکھتا تھا خواجہ محمد معصوم کی منقبت میں کہتا ہے:

چراغ ہفت محفل خواجہ معصوم ؛ منور، از فروغش ہند تا روم

اسی مضمون میں یہ بھی لکھا ہے:

"حضرت بابا فرید الدین شکر گنج اجودھیا تشریف لے گئے" (صفحہ ۹۶)

"اجودھیا" تو فیض آباد کا قدیم نام ہے، بابا فرید الدین شکر گنج اجودھیا نہیں "اجودھن" تشریف لے گئے تھے جو پنجاب میں واقع ہے اور پاک پٹن کا پرانا نام ہے، یہیں آپ کا مزار ہے۔

"... حضرت خواجہ نظام الدین اولیا کو شاہ جہاں آباد کی سیادت ارزانی ہوئی" (صفحہ ۹۶)

دلی کا نام شاہ جہاں آباد تو شاہ جہاں نے اپنے نام پر رکھا تھا، حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کے زمانہ کا ذکر کرتے ہوئے دلی کو شاہ جہاں آباد کہنا درست نہیں۔

"کتاب زندگی" میں حضرت حبیب عید روس کا جو ذکر کیا ہے تو اس سلسلے میں "قادریہ" کے ساتھ "رفاعیہ" بھی ضرور لکھنا تھا، طریقت کا یہ خانوادہ "رفاعی" کہلاتا ہے۔ قادریہ سلسلہ طریقت کی یہ "رفاعیہ" ایک شاخ ہے۔

"زہے نصیب خواجہ غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ نے یاد فرمایا، حج اصغر کی دعوت ہے"۔ (صفحہ ۱۷۷)

حرم کعبہ کے علاوہ کسی ولی یا نبی کے مزار کی زیارت کو "حج" سے نسبت نہیں دی جا سکتی۔ یہ عقیدت کا مبالغہ ہے (۱۰)

محترمہ نے حضرت سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار کا ذکر کیا مگر تعمیری خصوصیت کے اعتبار سے جو بات لکھنے کی تھی وہی چھوٹ گئی یعنی ان کے مزار کی عمارت پر «سیپ کا کام» قابل دید ہے۔

محترمہ قیصری صاحبہ نے ایک بات تو عجیب لکھی ہے کہ انھوں نے محبوب نگر میں لوبان کے اونچے اونچے درخت کھڑے ہوئے دیکھے تھے (صفحہ ۱۷۹)۔ دکن کیا (غالباً) ہندوستان کے کسی خطہ میں بھی لوبان پیدا نہیں ہوتا، انسائیکلوپیڈیا میں «لوبان» پیدا ہونے والے ملکوں میں جاوا، سماترا وغیرہ نام لکھے ہیں ہندوستان کا ذکر نہیں کیا گیا۔ اس کی یہ تاویل بھی خلاف واقعہ ہوگی کہ محبوب نگر میں ستر اسی (۷۰ - ۸۰) برس پہلے لوبان کے درخت تھے مگر بعد میں لوبان کے پیڑوں کی پیداوار کا سلسلہ بند ہوگیا۔ اگر ایسا سانحہ پیش آتا تو دکن کے جغرافیے اور دوسری کتابوں میں اس کا ذکر آنا چاہیئے تھا۔ محبوب نگر کے تو شریفے (سیتا پھل) مشہور ہیں جن کا ذکر جغرافیے میں موجود ہے۔

تازہ ترین اردو نامہ پڑھتے ہوئے جو باتیں کھٹکیں وہ عرض کر دی گئیں، مقصود تحقیق اور الفاظ کی صحت کے (زیادہ سے زیادہ) قریب پہونچنا ہے۔ غلطی ہر کسی سے ہوتی ہے، میں اپنی حد تک بولنے اور لکھنے میں بڑی احتیاط برتتا ہوں، پھر بھی زبان و قلم سے سہو ہو ہی جاتا ہے۔ اسی لئے تو انسان کو «مرکب من الخطاء والنسیان» کہا گیا ہے۔

والسلام

مخلص - ماہر القادری

۱۱ اپریل، ۱۹۷۳ء

حواشی

(۱) «قبر کی درود» بے معنی ہے۔ مصرع میں تحریف ہوگئی ہے۔ گلزار داغ (نولکشور) میں "قبر پہ" لکھا ہے

(۲) اصل مصرع یوں ہے: «برسوں پڑھے ہیں حضرت داؤد پر درود»۔

(۳) درود کے مؤنث ہونے کی واجد علی شاہ اختر کے علاوہ کوئی حتمی سند نہیں۔

(۴) آپ نے وہ مثالیں دی ہیں جہاں سابقہ جزو کلمہ بن گیا ہے۔ بے شعور، بے عقل، بے اثر کی طرح «بے طبع» کو بندھا ہوا کلمہ نہیں۔ لا طمع کہیے یا بے طمع۔ یہ سابقہ نافیہ کسی لفظ کے ساتھ بھی لگ سکتا ہے، عربی کا جوڑ کے ساتھ عام صورتوں میں مستحسن سمجھا جائے گا اور اعتراض سے بری۔

(۵) آپ کا خیال صحیح ہے۔ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کے اس حاشیے سے ڈاکٹر سبزواری مرحوم نے بھی اپنے تبصرے میں اختلاف کیا ہے۔

(۶) بکسنا کے ابتدائی معنی میں دونوں مفہوم شامل ہیں: کھلنا، گلنا۔

تمام کھال بکس جاوے گی اگوشت گل پڑے گا۔ (تہذیب الاخلاق، ۲: ۵۷۳)

جناب رسول خدا کا بکری کے ایک مردہ بچے پر گذر ہوا

جس کے کان بکس کر جاتے رہے تھے ۔ الحقوق و الفرائض ، ۳ : ۱۱۶

دل کے زخموں کے بکسنے پر جو تو ہنستا رہا ٭ اہلِ دل رویا کئے اہل نظر رویا کئے

(۷) دلی کی زبان میں گھٹا کی نسبت گٹا فصیح ہے ۔ بے خود موہانی ، ک : ۶۹

(۸) یہ لفظ ہماری لغت میں شامل ہے ، دیکھیئے « اردو نامہ » شمارہ ۴۲ ، (حصۂ لغت) ۔ لغوی معنی اس کے ، نظر نہ آنے والا ہوں گے ۔ یعنی پوشیدہ طور پر پنپنے والا ، نہ کہ کم نظر وغیرہ ۔

(۹) کنتھا کے اصل معنی قصہ بلکہ طولانی قصہ ہیں ۔ اس کی اصل غالباً کتھا ہے ۔ محاورے میں جھگڑا ، قضیہ ، لا یعنی مشغولیت وغیرہ ۔ شاہد صاحب کا کہنا ہے کہ کاروبار کے معنی میں نہیں سنا گیا ۔ دکنی لڑکیوں کے ایک کھیل میں یہ بول آتے ہیں :

کانی (کہانی) بولوں کنتھا بولوں سن گے سنگا رانی

کوا بیٹھا کوٹ پر ھگا بی بی کے ھونٹ پر ۔

(۱۰) موصوفہ نے احتیاط سے کام لیا ہے اور « جمع اصغر » لکھا ہے ، لوگ تو « خدائے مجازی » جیسے کلمات بھی بلا تکلف بولتے ہیں ۔

ش ۔ ح ۔ ح ۔

---

۱۱ ۔ ماہنامہ فاران کراچی ۔ ۱۸

جناب مکرم السلام علیکم

تازہ ترین اردو نامہ ملا ، آنکھوں میں نیند آرہی تھی مگر میں رسالے کے مطالعہ میں مصروف ہو گیا ، دو نشستوں میں اسے ختم کر کے دم لیا ، اس شمارے میں حسن ترتیب کے علاوہ مضامین کا تنوع بھی قابل تحسین ہے ۔ ۱۹۴۵ء کی بات ہے جگر مراد آبادی مرحوم اور راقم الحروف کھڑک پور کے مشاعرے میں شریک ہوئے وہاں سے کلکتہ سیر کے لئے گئے ۔ مدرسہ عالیہ کے قریب ایک شاعر کے یہاں قیام کیا ۔ حضرت وحشت سے سرراہ نیاز حاصل ہو گیا ۔ خان بہادر سید رضا علی وحشت مرحوم کی اردو غزلیں رسالوں میں تیرہ چودہ سال کی عمر سے پڑھتا رہا اردو نامہ میں ان کا فارسی کلام پڑھ کر طبیعت باغ باغ ہو گئی ، میری ناچیز رائے میں جناب وحشت کا فارسی کلام ان کی اردو غزلوں سے زیادہ دلکش اور بلند ہے ۔

مثنوی سراپا سوز « اختر » بھی پڑھی اور لطف آگیا ، متقدمین میں کیسے کیسے باکمال شعراء گذرے ہیں ، اردو زبان و ادب پر ان مشاہیر کا احسان ہے ۔

یہ سب پود اُنھی کی لگائی ہوئی ہے

«درود» کے سلسلے میں عرض ہے کہ میں نے «درود کسی کی زبان سے مونث نہیں سنا اور نہ کسی کتاب، رسالے یا اخبار میں پڑھا، کئی مہینے ہوئے مرزا داغ کے شعر میں «درود مونث نظر سے گزرا، مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ بہر حال درود کے مونث ہونے کی اکا دکا مثالیں ملتی ہیں۔ میں نے مثال میں نواب واجد علی شاہ اختر کا شعر پیش کیا اس پر آپ نے حاشیے میں تحریر فرمایا:

«درود کے مونث ہونے کی واجد علی شاہ اختر کے علاوہ کوئی حتمی سند نہیں ملتی»۔

جب کوئی لفظ کسی مشہور اہل زبان شاعر و ادیب کے یہاں مل جاتا ہے تو وہ سند ہوتا ہے بجز اس کے کہ اس سند ہی میں کوئی سقم ہو۔ آپ کو «حتمی» کی جگہ کوئی اور سند یا دوسری سند لکھنا تھا، نواب فصاحت جنگ بہادر جلیل نے اپنے رسالۂ تذکیر و تانیث میں درود کو تانیث و تذکیر کے اعتبار سے مختلف فیہ لکھا ہے اور مرزا داغ کا یہ شعر سند میں پیش کیا ہے:

کیا قبرِ ناتواں کی ترے بے نمود ہے ٭ افسوس فاتحہ ہے نہ جس کی درود ہے

راقم الحروف کی رائے میں صاحب نور اللغات اور فصاحت جنگ جلیل کے سامنے مرزا داغ کے عہد اور زمانے کے چھپے ہوئے دواوین رہے ہوں گے۔ پلیٹس سے بڑھ کر اور حتمی سند کیا ہو سکتی ہے، اس مستند و مقبول ڈکشنری میں درود کو مونث (S. F.) لکھا ہے ہاں! اس کے بعد قوسین میں (M ?) بھی درج کر دیا ہے اسی بنا پر میں نے عرض کیا تھا کہ ترقیٔ اردو بورڈ کی لغت میں درود کے معنی کے ساتھ یہ ضرور لکھ دیا جائے کہ اکثریت غالب اس لفظ کو مذکر بولتی ہے مگر اس کے مونث ہونے کی بھی خال خال مثالیں ملتی ہیں!

آپ نے حواشی میں تحریر فرمایا ہے:

"دلی کی زبان میں گھٹا کی نسبت گٹا فصیح ہے۔"

مگر جس طرح «گڑھنے» کو «گھڑنے» اور «گڑھائی» کو «گھڑائی» لکھنے کا رواج ہے، اسی طرح تحریر میں «گٹا» نہیں «گھٹا» عام طور پر املا کیا جاتا ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد «مرآۃ العروس» میں لکھتے ہیں:

«جھوٹے برتن مانجتے مانجتے گھٹے پڑ گئے ہیں»۔

«گٹا» کے متعدد معنی ہیں:

(۱) ہاتھ پاؤں کی ہڈیوں کا جوڑ۔ (۲) ٹخنے کی ہڈی اور کلائی کا جوڑ:

کھا کے ٹھوکر جو گری پاؤں کا گٹا ٹوٹا۔ (جان صاحب)

(۳) وہ حصّہ جہاں دونل ملائے جاتے ہیں۔ (۴) نیچے کا بند جو حقّے کے اندر رہتا ہے۔

(۵) ایک قسم کی شیرینی .... (نور اللغات)

پلیٹس میں بچوں کے ایک کھیل کے لئے بھی «گول گٹا» ملا، بچے یہ کھیل پتھر کے ٹکڑوں اور ٹھیکروں (PEBBLES) سے کھیلتے ہیں۔ «گٹا» بونے آدمی کو بھی کہتے ہیں۔ مختلف معنوں کے اس التباس سے بچنے کے لئے «گھٹا» ہی املا کرنا چاہیئے۔

رہا «بکسنا» تو اس سلسلے میں طالب علمانہ گذارش ہے کہ موجودہ دور میں کوئی یوں لکھے یا بولے:

«میں بکری کا گوشت لایا تھا مگر وہ بکس گیا»۔

تو «بکس گیا» سے سڑنے اور گلنے کا مفہوم کسی کے پلے نہیں پڑے گا۔ یہ کام ہے تو بڑا ہی دشوار طلب مگر آپ ہی کا بورڈ اس ہفتخوان کو طے کر سکتا ہے ــــ یہ کہ جن لفظوں کے بعض قدیم معنی کا آج قطعاً چلن نہیں ہے ان کے بارے میں وضاحت کر دی جائے کہ ان معنی میں اب یہ لفظ نہیں بولا جاتا۔

محترمہ قیصری بیگم صاحبہ نے خواجہ معین الدین اجمیری رحمتہ اللہ علیہ کے مزار کی زیارت کو اپنے مضمون (کتاب زندگی) میں «حج اصغر» لکھا، جس پر میں نے گرفت کی، آپ نے محترمہ کی مدافعت میں حواشی میں تحریر فرمایا:

«موصوفہ نے احتیاط سے کام لیا اور «حج اصغر» لکھا ہے لوگ تو خدائے مجازی جیسے کلمات بھی بے تکلف بول دیتے ہیں»

ان معاملات میں شریعت ہی معیار اور ماخذ ہے، شرعی اور دینی نقطۂ نگاہ سے «حج اصغر» ہو یا «حج اکبر» اس کی کسی بزرگ کے مزار یا خانقاہ سے تشبیہ دینا جائز نہیں۔ اس قسم کے مبالغوں سے شریعت میں روکا گیا ہے، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے کہ «میرے رتبے سے مجھے زیادہ نہ بڑھانا» مگر «اردو نامہ» کے حالیہ شمارے میں محترمہ قیصری بیگم کے مقالے میں یہ پڑھ کر کہ مولانا جماعت علی شاہ (علی پوری) ان کے پیر و مرشد تھے، محترمہ کے عقاید کا علم ہو گیا۔

«آفرین لاہوری بہ حیثیت قصیدہ نگار» ــــ اس مقالے میں جو یہ لکھا ہے کہ «نظیری کو بارہا سونے سے تولا گیا» «موتیوں سے منہ بھر دیا گیا» (صفحہ ۲۶) اس کا کتابی حوالہ فاضل مقالہ نگار کو ضرور دینا چاہیئے تھا، نظیری کے حالات میں راقم الحروف کی نظر سے کوئی ایسی روایت نہیں گزری۔ موتیوں اور جواہرات سے منہ بھرنے کا واقعہ محمود غزنوی کے درباری شاعر عنصری سے متعلق ہے۔ مقالہ نگار کا یہ کہنا کہ «نظیری کو بارہا سونے سے تولا گیا»۔ نہ صرف مبالغہ آمیز بلکہ خلاف واقعہ معلوم ہوتا ہے، اس قسم کے واقعات محض سماعت، حافظہ اور یادداشت کی بنا پر مضامین میں درج نہیں کرنے چاہئیں۔ پھر یہ جملہ ــــ «نظیری کو بارہا سونے سے تولا گیا» اس میں «سے» کی جگہ «میں» ہونا چاہیئے، یہ زبان کی فروگذاشت ہے۔ «سے» کے استعمال کا محل یہ ہے:

"چاندی کو سونے کے باٹوں سے تولا گیا"

شعر العجم میں علامہ شبلی نعمانی نے فارسی اشعار کا ترجمہ اس خوبصورتی سے کیا ہے کہ بعض اشعار اردو کے قالب میں ڈھل کر اصل اشعار سے حسین تر ہو گئے ہیں۔ آفرین لاہوری کے فارسی اشعار کا بھی غلام ربانی عزیز صاحب نے ترجمہ کیا ہے:

آبِ حیات می چکد از لفظ شستہ ام

"میرے پاکیزہ الفاظ سے آبِ حیات ٹپکتا ہے"۔ (صفحہ ۳۶)

"شستہ" اردو میں مستعمل ہے، اسے "پاکیزہ" سے بدلنے کی ضرورت نہ تھی۔ "شستہ الفاظ" میں جو ادبیت ہے وہ "پاکیزہ الفاظ" میں نہیں ہے۔

از بسکہ دردِ عشق بہ مضموں سرشتہ ام ✲ خیزد ز لیش مصرعِ من ہم چونی فغاں

"اور نیز وہ الفاظ دردِ محبت سے لبریز ہیں کہ ہر مصرعے سے آہ و فغاں کی آواز آرہی ہے۔"

"سرشتہ ام" کا ترجمہ "لبریز ہیں" درست نہیں، پھر "نے" کا ترجمے میں کوئی ذکر نہیں آیا اس شعر کا ترجمہ اس انداز کا ہونا چاہیے تھا:

"میں نے دردِ عشق کو مضمون میں سمو دیا ہے اور میرے ہر مصرع سے "نے" کی طرح فغاں بلند ہو رہی ہے"

چہ جنت! اصل جنت نو بہاری بر کجا باغی ✲ چہ آدم! منظہرے بر صورت خود کرد حمائش

"..... جسے خدا نے اپنا مثیل بنایا" (صفحہ ۳۸)

قطعاً غلط مفہوم اور اصل مفہوم پر بے جا اضافہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو "اپنا مثیل نہیں بنایا"۔ اللہ تعالیٰ کا معاذ اللہ کوئی مثیل، مشابہ اور ثانی نہیں، اس کی شان تو "لیس کمثلہ" ہے اور "منظہر" کو مثیل نہیں کہتے:

"خاک بر فرقِ من و تمثیلِ من" (مولانا رومؒ)

عرفی کا مصرع ہے:

مگس را باد زن در دست بر اطرافِ خواں بینی

اس کے ترجمے میں "مگس" کو جو اہلِ ہوس کہا گیا ہے (صفحہ ۴۶) وہ محلِ غور ہے "حریص اور ندیدے لوگ" ترجمہ کرنا تھا۔

مرزا داغ کا یہ شعر جو صفحہ ۹۵ پر درج ہے:

حوروں کا انتظار کرے کون حشر تک ✲ مٹی کی بھی ملے تو روا ہے شباب میں

اس سلسلے میں ایک لطیفہ یاد ہے۔ ایک صاحب مرزا داغ کے اس قدر مداح اور عقیدت مند تھے

فرمایا کرتے تھے کہ حضرت داغ اعلیٰ اللہ مقامہ نے کوئی شعر شریعت کے حدود سے باہر نہیں کہا، ان کی شاعری شریعت کی ترجمان ہے، اس پر ان کے دوست نے بہت کچھ سوچنے کے بعد داغ کا یہ مصرعہ :

مٹی کی بھی ملے تو روا ہے شباب میں

پڑھتے ہوئے ازراہ طنز پوچھا کہ حضرت داغ کے اس مصرعے کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟ داغ کے عقیدت مند مداح نے فوراً جواب دیا۔

" اس مصرعے میں استاد داغ رحمۃ اللہ علیہ نے تیمم کا مسئلہ بیان فرمایا ہے "۔

صفحہ ۱۱۱ پر محترمہ قیصری بیگم صاحبہ لکھتی ہیں :

" اللہ تعالیٰ نے داخلی بھی کروا دی "

" داخلہ " کی تانیث " داخلی " پہلی بار میری نظر سے گزری مگر نور اللغات میں یہ لفظ مل گیا اور میری معلومات میں اضافہ ہوا۔

" دکانیں لبالب بھری ہوئیں "۔ (صفحہ ۱۱۴)

میرے خیال میں دریا، نہر، تالاب، حوض وغیرہ کے علاوہ برتنوں کے لئے لبالب بولتے ہیں مگر مکانوں اور دکانوں کے اوپر تک بھر جانے کو " لبالب " نہیں کہتے۔

" مخلصین اردو " کے صفحہ ۲۲ پر لکھا ہے :

" پوتنا بہ معنی لپائی کرنا گوبر کے ساتھ اکثر بولا جاتا ہے اسی سے پتائی بھی ہے "۔

" پوتنا " لپائی کرنے کو نہیں کہتے، مٹی میں جو عموماً پیلی اور پیلی نہ ہو تو چکنی ہوتی ہے گوبر ملا کر ہاتھ سے لپائی ہوتی ہے، جب لپائی سوکھ جاتی ہے تو اس پر پتائی ہوتی ہے، قلعی سے پنڈول سے، ہاتھ میں کونچی (کوچی) لے کر " پتائی " کرتے ہیں اور کپڑے کی چھوٹی سی ڈھیری بنا کر پنڈول سے پتائی کی جاتی ہے۔ پتائی انگریزی کے (WHITE WASH) کے معنی میں آتا ہے۔ پوتنے میں گوبر استعمال نہیں ہوتا، سفیدی کرنے کو پتائی کہتے ہیں۔

جناب محمد احسن خاں نے " اجزائے لغت پر تبصرہ " کے صفحہ ۱۴۴ پر جو یہ لکھا ہے :

" ابھرنا بہ معنی (۱) سیر ہونا (۲) اکتانا (۳) حد سے بڑھ جانا۔ "

صفحہ ۱۴۵ پر ترقی اردو بورڈ کے حواشی نگار اس کے جواب میں رقمطراز ہیں :

" ان معنوں میں سند یا حوالہ درکار ہے۔ امیر اللغات اور فرہنگ آصفیہ میں یہ معنی نہیں دیئے گئے "۔

لایق سوانح نگار « نور اللغات » سے رجوع کیوں نہیں کرتے؟ اس میں « ابھرنا » کے معنی سیر ہونا اور اکتا
درج ہیں « کھیت کی کیاری میں پانی خوب اوپر تک بھر جانے ، تو یوں بولتے ہیں :
« کیاری ابھر گئی ہے ۔ یا کیاری میں پانی ابھر رہا ہے ۔»
اولغات میں یہ محاورہ شاید نہ مل سکے ، دوآبہ کے دیہات کی زبان ہے ۔
« مخلصین اردو اور ترقی اردو بورڈ » یہ مضمون پمفلٹ کی صورت میں پڑھ چکا ہوں ۔ (اردو نامہ)
میں دوبارہ زیادہ غور سے پڑھا ، آپ نے اپنی مدافعت میں تحریری حوالے اور دفتری مراسلات کے اقتباسات
دیئے ہیں ۔ اس سے بڑا ثبوت اور کیا چاہیئے ؟ اس مضمون کو پڑھ کر میرے ذہن و فکر کے بعض غلجانات
دور ہوئے ، معترضین کے پاس تحریری لوازمہ (سواد ۔ میٹریل) ہو تو منظر عام پر لائیں !
« اردو لغت » میں یہ پڑھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ « ارمان » کے معنی « گھمنڈ » بھی ہیں ۔ اور ڈپٹی
نذیر احمد کے ترجمہ قرآن کا اقتباس سند میں پیش کیا ہے :
« خدا نے جو تم میں سے ایک کو دوسرے پر برتری دے رکھی ہے ، اس کا کچھ ارمان نہ کرو »۔ (صفحہ ۲۱۷)
اس عبارت میں ارمان کے معنی گھمنڈ آخر کہاں سے نکل آئے ، ڈپٹی نذیر احمد نے اپنے ترجمہ میں « ارمان »
تمنا ، آرزو اور حسرت کے معنی میں لکھا ہے ۔ اصل آیت یہ ہے :

« وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ »

(سورۃ النساء) والمحصنات ۔

قرآن کریم کی آیت میں « تتمنوا » آیا ہے جس کے معنی تمنا کے ہیں ، مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی نے اس آیت
کا یوں ترجمہ کیا ہے ۔
« اور جو کچھ اللہ نے تم میں سے کسی کو دوسرے کے مقابلے میں زیادہ دیا ہے ، اس کی تمنا مت کرو (تفہیم القرآن)
حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کا ترجمہ :
« اور ہوس مت کرو جس چیز میں بڑائی دی اللہ نے ایک کو ایک پر » ۔
علامہ عبداللہ یوسف علی نے « تتمنوا » کا ترجمہ (COVET) کیا ہے جس کے معنی لالچ ، طمع
ہوس اور بڑھی ہوئی خواہش و آرزو کے ہیں :

AND IN NO WISE COVET THESE THINGS IN WHICH GOD BESTOWED HIS GIFTS...

ارمان کے معنی میں گھمنڈ جو لکھا گیا ہے اس پوری عبارت کو لغت سے حذف کر دینا چاہیئے ۔
« ارمن ۔ کوہ قاف ، کوہستان ، آذربائیجان ، کا ایک علاقہ جس کا حسن و جمال ضرب المثل ہے » (صفحہ ۲۲۳)

[ر]اقم الحروف کے خیال میں :

"جس کے (یا جہاں کے) باشندوں کا حسن و جمال ضرب المثل ہے"۔ موزوں تر ہے۔

صفحہ ۱۲۷ پر "آرزو نکال دینا" کے معنی میں "آرزو چھوڑ دینا" لکھ کر اس کی سند میں [یہ] عبارت دی گئی ہے :

"خدا نہ کرے تو نے میرا ارمان نکال دیا" (الف لیلہ و لیلہ)

"آرزو چھوڑ دینا" کے معنی اس عبارت میں نہیں ملتے "آرزو چھوڑ دینا" لکھنے کا یہاں کیا موقعہ [او]ر محل تھا؟ اس معمہ کو آپ ہی حل کریں گے۔ جب اس کتاب میں "الف لیلۃ و لیلۃ" کا آپ کی لغت میں ذکر [آ]ئے تو پورا نام درج فرما دیں۔ مگر جہاں بھی کتاب کا حوالہ دیں وہاں "الف لیلہ" لکھنا کافی ہے، اردو میں [ا]س کتاب کو "الُف لیلہ" بلکہ "اَلِف لیلہ" بولتے ہیں۔ کوئی اردو داں "الف لیلۃ و لیلۃ" نہیں بولتا اور نہ [لک]ھتا ہے۔

صفحہ ۲۵ ۷ پر "ارنا اوت" کے معنی "سنڈا، مسٹنڈا، جرائم پیشہ" لکھے ہیں اور مضامین حیرت [ک]ا یہ اقتباس سند میں پیش کیا ہے :

"چند ارنا اوتوں کے کوڑے مارے گئے اور دو کو گولی مار دینے کا حکم دیا گیا"۔

[ا : ارنا + س : اوھت — ہیکڑ، بد دماغ]

دو آبہ کے دیہات اور قصبات میں عورتیں "اوت" بولتی ہیں جس کے معنی اس شخص کے ہیں جو بن [ب]یاہا جوان ہو کر مرے۔ جرائم پیشہ کے معنی کہاں لکھے گئے ہیں کہ جن کے کوڑے مارے گئے ہیں وہ لازمی طور [پ]ر جرائم پیشہ بھی ہوں گے، اس لفظ "ارنا اوت" کے معنی یوں لکھنے چاہئیں :

"بن بیاہا (کنوارا) جوان پٹھا"۔

ایک مخلصانہ گذارش یہ ہے کہ آپ کے یہاں کی لغت میں انگریزی ڈکشنریوں کے انداز پر ایک لفظ [د]رج کر کے اس کے متعدد معانی لکھتے ہیں تو اصل لفظ کا املا نہیں کیا جاتا بلکہ اس کے مشتقات و متعلقات و [م]ترادفات۔

۲۷ اگست ۱۹۷۳ء

مخلص

ماہر القادری

نالاں

۱۲ــــ جناب مکرم

السلام علیکم

تازہ ترین اردو نامہ ملا، جس کے مطالعے سے مستفید ہوا۔

" میران تالپور کی شاعری " پر جو مقالہ ہے وہ معلومات افزا ہے، اس سلسلے میں اتنا عرض کردوں گا
کہ بادشاہوں، شاہزادوں اور امیروں کی شاعری کا مسئلہ مشتبہ ہے۔ ہمارے دور میں نظام دکن کے صاحبزادے
نواب معظم جاہ بہادر شجیع کی ہزاروں غزلیں دوسرے شاعروں کی کہی ہوئی ہیں۔ وہ خود ناموزوں طبیع واقع ہو
ہیں۔ بلکہ ہائی نس نواب سعادت علی خاں والئی ریاست ٹونک کی غزلیں حضرت جام کی کہی ہوتی تھیں۔ اتنے
اچھے اشعار:

ترے غم کی شکایت کر رہا ہوں ٭ یہ کیا کفران نعمت کر رہا ہوں

اُنہیں دیکھو وہ رخصت ہو رہے ہیں ٭ مجھے دیکھو میں رخصت کر رہا ہوں

تک جام صاحب نے نواب صاحب ٹونک کو کہہ کر دے دیئے تھے۔ یہ بات میں پوری تحقیق کے ساتھ کہہ رہا ہوں
تین بار ٹونک جانا ہوا، ہز ہائی نس نواب سعادت علی خاں مرحوم کے ساتھ شکار میں بھی سفر کا اتفاق ہوا۔ اُن کے
ساتھ تھیٹر بھی دیکھا، شرف ہمطعامی و ہم کلامی بھی حاصل رہا، مشاعروں میں بھی شرکت رہی۔

" نوادر داغ " میں حیرت ہے کہ حضرت داغ جہاں استاد کے شاگردوں کی رائیں اُن کے
کلام پر درج کی گئی ہیں، مثلاً ابر گنوری، حضرت احسن مارہروی کے شاگرد ہیں، اُن کی رائے داغ کے کلام پر کیا
وزن رکھتی ہے! نواب مرزا داغ کے کلام پر امیر مینائی، ظہیر گورگانی، منیر شکوہ آبادی، محسن کاکوروی،
رضا علی وحشت، سر عبدالقادر، مولانا ظفر علی خاں، بے نظیر شاہ، شاد عظیم آبادی، صفی لکھنوی، پیارے صاحب
رشید، فانی بدایونی جیسے مشاہیر کی آراء کا وزن محسوس کیا جاسکتا ہے۔

" جس طرح ایصال ثواب کرنا ہو یہیں سے کی جاتی تھی " (صفحہ ۷۷) " یہیں سے کیا جاتا تھا " لکھنا
تھا کیوں کہ " ایصال " مذکر ہے..... اپنے اس مضمون میں محترمہ قیصری بیگم صاحبہ نے جو یہ لکھا ہے۔

" اور سرکار دربار کے جو حاضر باش غلام ہیں وہ بلند قامت حبشی نژاد ہیں ـــــ
ان کو بی بی حلیمہ سعدیہ رضہ کی اولاد کہا جاتا ہے " (ص ۷۸)

محترمہ کی یہ اطلاع کسی عنوان اور جہت سے صحیح نہیں ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رضاعی والدہ
حضرت حلیمہ تو بنو سعد کے قبیلے سے تعلق رکھتی تھیں۔ اُس قبیلے کا حبش سے کوئی دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ حرم
کعبہ اور مسجد نبوی میں یہی حبشی نژاد حاضر باش خدام ہیں۔

"آپ نے یہاں کی ہریس کھائی ہے" (صفحہ ۷۹)۔ ہریس نہیں "ہریسہ" عام طور پر بولا اور لکھا جاتا
۔ یہ مذکر ہے۔

"حسین بی اور عابد علی صاحب کی خالہ جو اس عرصے میں علیل رہے تھے" (ص ۸۳) یہ دکن میں رہنے کا
رہے، وہاں اسی طرح بولتے ہیں، دو عورتوں کا یہاں ذکر ہے، اس لئے "علیل رہی تھیں" لکھنا چاہیئے تھا۔

راقم الحروف نے "کنتھا" کے معنی ہیں .... "جھمیلا، معاملہ، مصروفیت اور کاروبار"
لکھا تھا تو "کاروبار" (کاربار) سے مقصود تجارت یا بیوپار نہ تھا، کاربار مشغولیت کو بھی کہتے ہیں! نواب
ناظم جاہ بہادر نے اس لفظ (کنتھا) کو ٹھیک انہیں معنوں میں استعمال کیا تھا۔

"ایسا ہی جھمیلا رہتا ہے"
"اسی قسم کی مصروفیت رہتی ہے"
"ایسا ہی کاربار یعنی مشغولیت رہتی ہے"

حسین سروری صاحب نے:

"اب اس بات کا کنتھا مت کرو"

کی جو تشریح فرمائی ہے:

(راز ہی راز رہنے دو) صفحہ ۹۹

یہ محل غور ہے ۔ ("چرچا مت کرو" کے معنی نکلتے ہیں! صفحہ ۲۷ پر "ارنڈ" کی تشریح میں جو یہ لکھا ہے۔

"جس کے بیج کی گری سے ارنڈی کا تیل نکالا جاتا ہے"

اس میں "ارنڈی" زائد ہے۔ ظاہر ہے کہ ارنڈ کے بیج کی گری سے جو تیل نکلے گا وہ ارنڈی کا تیل ہی ہوگا! مزید
وضاحت کے لئے آخر میں اس جملے کا اضافہ کیا جاسکتا ہے۔

"اس تیل کو ارنڈی کا تیل کہتے ہیں" (۱)

صفحہ ۳۴ پر "اروی" کو "ایک قسم کی جڑ جو ترکاری کے طور پر پکائی اور کھائی جاتی ہے"۔ لکھا ہے
پلیٹس اور فرہنگ آصفیہ میں بھی اس لفظ کے یہی معنی دیئے ہیں، یہی وہ مقام ہے جہاں مرتبین لغت کو غور و فکر
کی ضرورت لاحق ہوتی ہے اور دوسری لغات کی محض نقل پر اکتفا نہیں کیا جاسکتا، مجھے اس ضمن میں یہ عرض
کرنا ہے کہ "اروی" (گھیا یا گھوئیاں) کیا درختوں پودوں اور بیلوں کی جڑ کی مانند ہوتی ہیں؟ کیا زمین کے
اندر سے حاصل کئے ہوئے کسی پھل پر جڑ کا اطلاق ہو سکتا ہے؟ افہم فتدبر! (۲)

"جمع ارہریں، شاذ، قدیم" (صفحہ ۳۶)

مونگ ، ارہر ، ارد ، مسور ، کی جمع نہیں آتی ، کسی قدیم کتاب میں " ارہریں " لکھا ہوا ہے تو وہ لکھنے والے
کی غلطی ہے ، اُس کے ذکر کی ضرورت نہ تھی ! متقدمین شعراء اور اہل قلم کی غلطیاں سند نہیں بن سکتیں

صفحہ ۷۴ پر "اڑ گئی ۔ اڑ گیا " کے جو معنی درج ہیں ، اُس میں اس قسم کا جملہ بھی درج ہونا چاہیئے تھا
" میرے نام کی تو اس گھر میں ہر چیز اُڑ گئی "
بمعنی " ہر چیز جاتی رہی " ۔ (میں کسی چیز سے فائدہ نہیں اٹھا سکتی یا نہیں اٹھا سکتا) اڑنا کے معنی
نیست و نابود اور فنا ہونے اور نام و نشان مٹ جانے کے ہیں ۔ مرزا داغ کا شعر ہے :

مرے آشیاں کے تو تھے چار تنکے ٭ چمن اڑ گئے آندھیاں آتے آتے (۴)

" کسی کا مکان دبایا کسی کی دکان اڑائی " (ص ۷۵)
دکان ، مکان ، ملک ، یعنی غیر منقولہ جائیداد کے لئے اڑانا نہیں بولا جاتا ۔ !
" چھیننا لے بھاگنا ، غائب کر دینا چرانا " ۔ کے معنی میں مندرجۂ بالا عبارت درج کی گئی ہے ، جو
محل غور ہے ، دکان کا سامان تو غائب کیا اور چرایا اور لے بھاگا جا سکتا ہے مگر دکان کو کون غائب کر سکتا
ہے ! " کسی کی دکان ہتھیالی " کا محل تھا ۔ راقم الحروف نے بار بار عرض کیا ہے مشاہیر کی عبارتوں او
اشعار کو سند میں پیش کرتے ہوئے خاصی چھان پھٹک کی ضرورت ہے :

نوروز کی رنگینی بلبل کو اُڑائے گی ٭ پھر پھولوں کا گلشن میں جامہ جو گلابی ہے (ص ۷۵۸)

" بلبل کو اُڑائے گی " ۔ کے معنی " بے خود بنانا " میری ناقص سمجھ میں تو نہیں آتے ! (۵)

اکتوبر ۷۳ء کے " اردو نامہ " میں جو میرا خط شائع ہوا ہے اُس میں ٹائپ کی خاصی غلطیاں رہ گئیں
شکر گزار ہوں کہ آپ میری تحریریں چھاپتے رہتے ہیں !

صفحہ ۸۴ (اُردو نامہ ماہ اکتوبر ۷۳ء) محترمہ قیصری بیگم لکھتی ہیں ۔
" بہت سے لوگوں کی ہمتیں بندھ گئیں کہ عورت ذات نے اتنا لمبا سفر بغیر مرد کے کیا "
دین و شریعت کا واضح حکم یہ ہے کہ عورت کو حج کا سفر محرم مرد کے بغیر نہیں کرنا چاہیئے ! دین کے جو
فرائض و واجبات ہیں اُن کے ادا کرنے کے طریقے بھی اللہ اور رسولؐ نے بتائے ہیں ۔

" کتاب زندگی " میں " کُنڈے " کے معنی تو سین میں " جھیل " لکھے ہیں ، حالانکہ " جھیل " قدرتی ہوتی
ہے اور کنڈہ پانی روک کر آبپاشی کے لئے بنایا جاتا ہے ! کنڈہ کا صحیح ترجمہ Pool ، POND پوکھر ، ڈہر اور جوہڑ
ہے ؛ مثلاً بلدہ حیدر آباد میں جو میر جملہ کا تالاب ، نینی تال اور بھوپال میں تال یعنی جھیلیں ہیں ، اُن کو " کنڈے "
نہیں کہہ سکتے ؛ کنڈہ کا ترجمہ " تالاب " تو ہو سکتا ہے مگر " جھیل " (LAKE) نہیں ہو سکتا !

سرسید احمد خاں دلی کے اشرف الشرفا اور اردو زبان کے محسن ہیں مگر چھوٹا منہ بڑی بات ہوگی جو یہ عرض کروں کہ پانی پت کے مولانا الطاف حسین حالی کی طرح سرسید زبان و روزمرہ کے معاملے میں زیادہ محتاط نہیں ہیں! پلیٹس سرسید کا ہم عصر ہے، اُس نے "اڈریس" (یا ایڈریس ADDRESS) اپنی لغت میں درج نہیں کیا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ "اڈریس" اُس دور میں عوام کی بول چال میں شامل نہ تھا۔ سرسید نے "ایڈریس" اپنی تحریروں میں جو استعمال کیا ہے اس کا سبب یہ ہے کہ وہ انگریزی تمدن و تہذیب سے جس میں انگریزی زبان بھی شامل ہے، خاصے متاثر تھے۔

فرہنگ آصفیہ اور نور اللغات، سرسید احمد خاں کے بعد کی لغات ہیں ان دونوں میں "ایڈریس" کو مذکر لکھا ہے! سرسید کا اسے مونث لکھنا قابل استناد نہیں ہے۔ ترقی اردو بورڈ کی مرتب لغت کی جب پہلی قسط "اردو نامہ" میں شائع ہوئی تھی اور اُس میں ناصر نذیر فراق دہلوی جیسے مستند اہل زبان ادیب کے حوالے سے "نوکرانیاں" کی بجائے "نوکریں" لکھا گیا تھا۔ تو سرسید احمد خاں کی (ایڈریسیں) بھی اسی قسم کا تسامح ہے "ایڈریس" بالاتفاق مذکر ہے! (٦)

"ایک نہایت قوی رسم اجتماع و احتفال موجود ہے" (ص ۱۱۰)

اس اقتباس میں "رسم" کی نسبت سے اس کی صفت "قوی" کھٹکتی ہے، موجودہ عربی میں احتفال اور حفلہ، جلسہ (MEETING) کے معنی میں بولا جاتا ہے۔ لفظ "محفل" بھی "ح، ف، ل" سے مشتق ہے (٧)

صفحہ ۱۱۰ پر "ادماج" کی تعریف یوں کی ہے۔

"ایک صنعت جس کا مطلب یہ ہے کہ کلام سے دو معنی حاصل ہوں لیکن دونوں معنی ایک دوسرے کی ضد نہ ہوں جیسے اس شعر میں:

کون ہوتا ہے حریف مے مرد افگن عشق ٭ ہے مکرر لب ساقی پہ صلا میرے بعد (غالب)

اس شعر میں کسی لفظ سے دو معنی نہیں نکلتے بلکہ مصرع اولیٰ کے لب و لہجہ سے دو معنی نکلتے ہیں مشہور و معروف ماہر فن عروض خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی نے "ادماج" کی تعریف اس طرح کی ہے۔

"ایک کلام سے دو معنی نکلتے ہوں اور قائل کا قصد دوسرے معنی کا نہ ہو:

وہ پڑھ کے مطلع تو، اب دکھاؤں برش تیغ ٭ کہ جس کو سن کے گلے کاٹنے لگیں خونخوار

"شاعر کا مطلب تو یہ ہے کہ ممدوح کے تیغ کی برش کا ایسا بیان کروں کہ جس کو خونخوار سن کر آپ اپنے گلے کاٹ لیں مگر اس شعر سے یہ معنی بھی پیدا ہوتے ہیں کہ خونخوار دوسروں کے گلے کاٹنے لگیں۔

(شاعری کی چوتھی کتاب)

فاران

اکتوبر کے اُردو نامہ میں راقم الحروف کا جو خط شائع ہوا ہے، اُس کے آخری جملے غالباً ٹائپ میں آنے سے رہ گئے، راولپنڈی کے ایک اہلِ قلم نے مجھ سے دریافت کیا ہے کہ یہ کیا معمہ ہے؟ میری گزارش یہ ہے کہ ترقی اُردو بورڈ کی لغت میں جو یوں لکھا جاتا ہے

؍ منہ ــــ آنا ــــ دیکھنا ــــ لگنا ــــ ٹیڑھا کرنا

اس کی کتابت یوں ہونی چاہیئے

منہ ــــ

منہ آنا ــــ

منہ دیکھنا ــــ

منہ لگنا ــــ

منہ ٹیڑھا کرنا ــــ

یعنی اصل اور بنیادی لفظ اُس کے مشتقات و توابع کے ساتھ ہر بار لکھا جائے؛ ہم اُردو داں اسی طرح لغات میں الفاظ پڑھنے کے عادی ہیں، آپ جب یہ نشان ــــ لگاتے ہیں تو جگہ کی بچت بھی نہیں ہوتی اس جگہ (ــ) میں اصل لفظ لکھا جاسکتا ہے!

ترقی اُردو بورڈ کی "لغت" کا نام آخر کیا رکھا؟ میں تو اردو فرہنگ کو ترجیح دیتا ہوں۔ "فرہنگ" کے معنی میں بڑی وسعت اور ساتھ ہی نغمگی پائی جاتی ہے! آپ کے لئے دعائیں اور نیک تمنائیں!

خیر اندیش

ماہر القادری

حواشی:-

(۱) درست ہے۔

(۲) جڑ کہنا درست ہے اور تشریح کا یہ سائنٹفک طریقہ ہے، البتہ ہر جڑ ترکاری کے طور پر مستعمل نہیں۔ مزید تشفی کیلئے دیکھئے پلیٹس میں اروی کی تشریح نیز POTATO یا TURNIP کی تشریح آکسفورڈ ڈکشنری میں۔

(۳) ہم صحیح یا غلط کا حکم نہیں لگاتے۔ خصوصاً مستند اساتذہ کے بارے میں۔ شاذ اور قدیم کی قید ہم نے لگا ہی دی ہے۔

(۴) یہاں اس کا محل نہیں۔ یہ معنی اڑنا یا اڑ جانا میں آئیں گے۔

(۵) اڑانا سے مراد جامے سے باہر کرنا۔ اور یہ معنی دیئے ہوئے ہیں۔ (۶) ہم صحیح یا غلط کا حکم نہیں لگاتے۔

(۷) یہ عبارت احسن خاں صاحب تبصرہ نگار کی ہے۔ جسے ہم نے من وعن نقل کیا ہے۔

(۸) اس شعر کے دو ہی معنی نکلتے ہیں۔ پہلے مصرع کو صلائے ساقی سمجھیں اور پھر شعر پڑھیں۔ یہ دونوں معنی ایک دوسرے کی ضد بھی نہیں ہیں اور نہ دوسرے معنی کی صراحت ہے جو ادماج کیلئے لازم ہے۔ (دیکھئے بحر الفصاحت)

۱۳-

مکرمی و محترمی

سلام و رحمت :

ماہ اپریل (۸۶ء) کا تازہ ترین اُردو نامہ ملا۔ اس شمارے کے مضامین میں بڑا تنوع پایا جاتا ہے، اس انتخاب و ترتیب میں آپ کی خوش ذوقی کا بھی دخل ہے۔ کل پاکستان نعتیہ مشاعرے میں آپ کی نعت خوب رہی۔ حمد اور نعت و منقبت میں کچھ نہ کچھ کہتے رہیے، اس سعادت کے حصول کے مواقع آپ کو ہر وقت حاصل ہیں۔ نعت رسول کا ذکر چھڑا تو تسکین قریشی مرحوم کی نعتیہ غزل کا ایک مصرع یاد آیا جو اپنی جگہ خود ایک غزل ہے

محمد عربی سیّدی و مولائی

"ترقی اُردو بورڈ" کے لغت نامہ کو پڑھ کر ایک ایسا لفظ یاد آگیا جو بچپن میں بڑے بوڑھوں کی زبانی سنا تھا مگر تقریباً نصف صدی سے یہ لفظ پڑھنے اور سننے میں نہیں آیا! چھتری کے معنی میں ہمارے نواح کے لوگ "اڑانی" (صفحہ ۷۶۱) ہی بولتے تھے! شب میں عربی و فارسی کے متبحر عالم مولانا محمد افضل جے پوری سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے فرمایا کہ راجستھان میں "ڑ" کی جگہ "ڈ"، یعنی اڑانی کو اڈانی بولتے تھے! لب و لہجہ کے ایسے اختلافات اُردو بولنے والے علاقوں میں ملتے ہیں اور ملنے چاہئیں۔

آپ کی لغت کے صفحہ ۷۶۳ پر "اڑبنگا" (۱) کے جو معنی لکھے ہیں وہ مزید شرح و وضاحت چاہتے ہیں یہ لفظ مرکب ہے "اڑ" اور "بنگا" سے: اڑ کے معنی آڑے آنا اور روک کے ہیں "بنگا" کے معنی ہیں۔ بانس ڈنڈا، سوٹا (سونٹا)! راستہ روکنے کے لئے بانس یا ڈنڈے کی وضع کی کوئی لکڑی راستے میں لگا دی (یا ڈال دی) اور کھڑی کر دی جائے اس کا نام "اڑبنگا" ہے! چلتے ہوئے کام میں پچڑ لگانے، روکنے اور حارج ہونے کے معنی میں یوں بولتے ہیں:

"ٹھیک کام چل رہا تھا مگر ایک اپنے دوست نے اڑبنگا لگا دیا"

"بنگا" سے گالی (دشنام) کا بھی ایک جملہ بنتا ہے! اگر اس اشارے کو لوگ نہ سمجھے تو ضرور تاً اس جملے کو بھی لکھ دوں گا۔

صفحہ ۷۸۸ پر "اڑیل" کے معنی "اڑیل فقیر" بھی آنا چاہیئے، ایسا فقیر (گدائے مبرم) جو بغیر لئے نہ ٹلے، اور اس کی یہ "اڑ" (ضد) ہو کہ کچھ نہ کچھ لے کر ہی یہاں سے ٹلوں گا!

ہاں! راقم الحروف نے اپنے گزشتہ خط میں "ارنڈی کے تیل" کی جو وضاحت کی تھی اُسے آپ نے درست تسلیم فرمایا۔ اس سلسلہ میں "ارنڈی کا تیل"، آپ کی لغت میں آنے سے رہ گیا: فرہنگ آصفیہ میں "انڈی" کو گنواروں کی زبان لکھا ہے، اور پلیٹس میں۔ انڈی :- (۲) CONTRACT FROM ARANDI

یوپی کے دیہات میں " اڈی کا تیل " بولنے کا عام رواج ہے، پوربی اضلاع میں " رینڈی " بولتے ہیں؛ ہاں! " اڈ " کے سلسلے میں ایک اور لفظ یاد آیا ـــ اڈہنگ ـــ شاہراہ، روڈ، پگ ڈنڈی اور معروف راستے کو چھوڑ کر جو راستہ جنگل، میدان اور کھیتوں میں ہو کر اختیار کیا جائے اُسے " اڈہنگ " بولتے ہیں! لغات میں یہ لفظ مجھے نہیں ملا، مگر میں نے سنا ہے، اس قسم کے الفاظ تحقیق طلب ہوتے ہیں اور تحقیق ہو جائے تو " لغت " میں ان کے آنے سے لغت کی قدر و قیمت میں اضافہ ہوتا ہے!

" حسرت موہانی کا آخری کلام " میں جو اشعار درج کیے گئے ہیں، اُن میں بعض اشعار سطحی ہیں اور مولانا حسرت موہانی جیسے عظیم و منفرد غزل گو کے رتبہ سے فرو تر ہیں۔

مرے سرمایہ ہوش و خرد کو بیک حکم جنوں بیکار کر دے

" حکم جنوں " سے آخر کیا مراد ہے؟ میں یہ عرض کرنے کی جراُت کروں گا کہ مصرع ثانی میں شعریت کی خاصی کمی پائی جاتی ہے، پھر " سرمایہ " کے لئے بیکار کرنے کا لفظ بھی محل غور ہے:

غلط ہے دعوئ عرفان حق ارباب حکمت کا حقیقت ان کی بوجھی جاتی ہے، جانی نہیں جاتی

" بوجھی جاتی " پڑھتے ہوئے زبان روانی و نغمگی کی کمی محسوس کرتی ہے " ان " کی ضمیر کا مرجع دعویٰ یا دعوے! پھر جو چیز بوجھی جائے گی وہ جانی بھی جائے گی:

تصوف نے حسرت سنا خوب نغمہ بیان عرب کا زبانِ عجم سے

" بیان عرب کا نغمہ " اس میں کس قدر تکلف پایا جاتا ہے، بیان " حشو و زاید " ہے، پھر " تصوف " اس شعر میں اس طرح استعمال ہوا ہے جیسے تصوف کسی آدمی کا نام ہے۔ علامہ اقبال نے اس خیال کو یا اس مفہوم کے پس منظر کو کس قدر حسین انداز میں ادا کیا ہے:

نغمہ ہندی ہے تو کیا لے تو حجازی ہے مری

حسرت کا ایک اور شعر ہے:

جب سے کہا عشق نے حسرت مجھے کوئی بھی کہتا نہیں فضل الحسن

فاضل مضمون نگار نے حیرت ہے ایسے شعر کے پیرایہ کی لطافت کی تعریف فرمائی ہے! مولانا فضل الحسن نے اپنا تخلص " حسرت " رکھا تھا، عشق نے انہیں حسرت آخر کب کہا تھا اور کس طرح کہا تھا:

عاشق وہی عاشق ہے جو رسوائے جہاں ہو معشوق وہی حق ہے جو " بے نام و نشاں " ہو

یہ شعر اگر مجاز کا نہیں " حقیقت " کا ہے تو پھر مصرع اولیٰ جو مجاز کا ہے، اُس سے مصرع ثانی کی چول ٹھیک نہیں بیٹھتی اور جوڑ نہیں لگتا، اس سے زیادہ مجال عرض نہیں: ہم تو حسرت موہانی کے ایسے شعروں کے قایل ہیں:

تری محفل سے ہم آئے مگر با حال زار آئے ٭ تماشا کامیاب آیا، تمنا بیقرار آئی

جبین یار پر غصے میں حسرت ٭ فروزاں ہے جمال سر گرانی

حسن بے پروا کو خود بین و خود آرا کر دیا

کیا کیا میں نے کہ اظہار تمنا کر دیا

یہ وہ اشعار ہیں جو تغزل کی معراج ہیں اور حسرت کے کلام میں جگہ جگہ یہ معراج پائی جاتی ہے
مولانا سیماب کے اس مصرعہ پر :

حضور! آپ کے آئینہ دار ہم بھی ہیں

حضرت داغ نے جو ریمارک دیا ہے :

"حضور ـــ ہمارے یہاں پیر و مرشد کو کہتے ہیں، معشوق کو نہیں کہتے" (صفحہ ۸۹) تو ہو سکتا ہے کہ دلی میں حضور کا استعمال معشوق کے لئے نہ ہوتا ہو مگر حضرت امیر مینائی جو بلند پایہ شاعر ہونے کے علاوہ عالم و فاضل اور لغت نگار بھی تھے، فرماتے ہیں :

آنکھیں ملائیں آپ تو کچھ درد دل کہیں ٭ پھروں مزاج ہی نہیں ملتا حضور کا

کیوں بھنویں تانتے ہو بندہ نواز ٭ سینہ کس وقت میں سپر نہ کیا

اس میں "بندہ نواز" محبوب کے لئے استعمال ہوا ہے اور اس کا لب و لہجہ، آہنگ اور مفہوم وہی ہے جو "حضور" کا ہے ۔ چوں کہ راقم الحروف اشعار میں "حضور" محبوب کے لئے پڑھتا اور سنتا رہا ہے اس لئے یہ لفظ میرے شعر میں بیساختہ نظم ہو گیا :

ستم کے بعد ندامت پھر اس کے بعد کرم ٭ حضور! اتنے تکلف کی کیا ضرورت ہے

"ہدایت نامہ داغ" کا ایک شعر ہے ـ

ایک مصرع میں ہو تم، دوسرے مصرع میں ہو تو ٭ یہ شتر گربہ ہوا میں نے اسے ترک کیا

(صفحہ ۱۰۱) ـ اس شعر سے تو ایسا مترشح ہوتا ہے جیسے "شتر گربہ" کا عیب اساتذہ فن اور شاعروں کے نزدیک گوارا تھا اور داغ نے جرأت کر کے اسے ترک کیا ـ حالاں کہ "شتر گربہ" شعر کا وہ عیب ہے جو سب کے نزدیک قابل ترک اور نا قابل قبول ہے! غالب کے اس شعر میں :

شور پند ناصح نے زخم پر نمک چھڑکا ٭ آپ سے کوئی پوچھے تم نے کیا مزہ پایا

شعر گریہ نہیں ہے بلکہ زبان و روزمرہ کا حسین و نازک استعمال اور بڑا لطف ہے! "آپ" کس قدر لطیف
نواب نثار یار جنگ بہادر مزاح، مشہور شاعر علی اختر کے حقیقی چچا، نظر حیدر آبادی کے دادا
کاظم علی باغ تمیذ داغ کے چھوٹے بھائی اور زہرہ نگاہ کے نانا تھے، انہوں نے مجھے داغ کی ایک نظم سنائی
جس میں حضرت داغ نے الفاظ کی بعض پابندیاں اپنی ذات پر لگائی تھیں، اُن میں ایک لفظ "سدا" (ہمیشہ کے
معنی میں) بھی تھا! اس لفظ کا استعمال اگر ترک کر دیا جائے تو "سدابہار" اور "سدا سہاگن" جیسی حسین ترکیب
سے ہاتھ دھونے پڑیں گے۔

محترمہ قیصری بیگم صاحبہ نے گلبرگہ شریف کی حاضری کی جو تفصیل دی ہے، اس نے اب سے تقریباً ۳۵
برس قبل کی یاد تازہ کر دی، اسی درگاہ کے صحن میں نواب بہادر یار جنگ کی تقریر ہوئی، ہزاروں کا مجمع تھا
میں نے اپنا سلام (ظہور قدسی) پڑھا۔

سلام اس پر کہ جس نے بیکسوں کی دستگیری کی
سلام اس پر کہ جس نے بادشاہی میں فقیری کی

مرزا یاس یگانہ بھی اس جلسہ میں موجود تھے!

چوں کہ آپ کا رسالہ مذہبی نہیں ہے اس لئے کوئی بحث چھیڑنا نہیں چاہتا، صرف اتنی گزارش ہے کہ
قرآن کریم میں، احادیث رسولؐ میں، اقوال صحابہؓ اور فقہ کی کتابوں میں قبروں اور مزاروں کے لئے "عرس"
نام کا کوئی لفظ نہیں ملتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی قبر کے بارے میں ممانعت فرمائی۔

"اسے صنم نہ بنانا اور میلے نہ لگانا"

مسدس حالی میں اس قسم کے عقاید و اعمال پر دوٹوک انداز میں تنقید کی گئی ہے۔ ایمان اور توحید کا چولی دامن
کا ساتھ ہے۔

میں نے اپنے متعدد خطوں میں یہ بات کہی ہے کہ متقدمین شعرا ہوں یا نثر نگار، اُن سے بھی زبان و بیان
کی غلطیاں سرزد ہوئی ہیں، یہ حضرات زبان و روزمرہ میں کوئی شک نہیں سند بھی ہیں مگر جہاں غلطی کرتے
ہیں وہ غلطی سند نہیں بن سکتی: جرأت کا شعر ہے:

پردہ مت منہ سے اٹھانا زنہار — حجلہ میں اوسان نہیں رہے گا

"اوسان" متفقہ طور پر جمع ہے واحد نہیں ہے۔ قافیہ (دھیان، احسان) کی مجبوری کے سبب انہوں نے
"اوسان کو واحد نظم کیا، مصحفی کا شعر ہے:

آتے ہی جب بجائی ہے اس نے چمن میں چٹخ — دیکھ اُس کو ہوگیا ہے ہر اک گل کا رنگ فق (۳)

...میں کئی باتیں محل غور ہیں، کیا "چخ" جمع بولا جاتا ہے ؟ "کیا چخ مچانا ۔ روزمرہ ہے! عام طور پر "چخ چلی" اور "چخ رہی" یا "چخ ہوئی" بولتے ہیں! پھر قافیہ کی مجبوری اور رعایت کے سبب ...نے "فق" کو "فخ" باندھ دیا ۔ یہ قافیہ کا کھلا ہوا عیب ہے! ناسخ کا شعر ہے :

کس گل کا منہ چمن میں ترے آگے فق نہیں　　　یہ رنگ گل اڑا ہے اُفق پر شفق نہیں

...اجہ میر درد کا شعر ہے :

ہم فقیروں کی طرف بھی تو نگاہیں دمبدم　　　پھینکتے جاتے تھے آپ آکے وہ خیراتیں کہاں

...رات خیر کی جمع ہے، بہ معنی نیکیاں اور بھلائیاں! مگر اُردو میں مونث اور مفرد بولتے ہیں! ...خیرات" کی جمع "خیراتیں" تحقیق طلب ہے، یہاں بھی یہی صورت ہے ۔ خواجہ میر درد کی غزل کے ...فیے ۔ باتیں، برساتیں اور ملاقاتیں ہیں!

اور موسم میں جدا مجھ سے رہو تم تو رہو　　　پر مری جاں نہ کرو موسم برسات میں فرق (۴)

...یا مصحفی کے اس شعر کو سند بنا کر "فرق کرنا" جدائی اور دور رہنے کے معنی میں لغت میں لکھا جائے گا؟

باتوں نے اس کی ہم کو خاموش کر دیا　　　آگو زباں تھی لیکن اب گوش کر دیا (مصحفی)

...ر مصرع ثانی ٹھیک کتابت ہوا ہے تو "گوش کر دینا" کیا کوئی اردو محاورہ ہے ؟ (۵)

اس محاورے کا اب چلن نہیں رہا ۔ یہ لفظ متروک ہے ۔ یہ لفظ شاذ بولا جاتا ہے ۔ اس فیصلہ آپ نہ کریں گے تو اور کون کرے گا، (۶) مثلاً مصحفی کا شعر ہے .

یہ حالت ہے کہ دل سینے سے گھبراتا ہے بے موجب
طبیعت پر تکدر اپنی آجاتا ہے بے موجب

...ج کل "بے موجب" نہیں "بے سبب" اور "بے وجہ" بولنے اور لکھنے کا چلن ہے یا تو اس شعر کے "بے موجب" کا لغت میں ذکر ہی نہ کیا جائے اور ذکر آئے تو لکھ دینا چاہیئے کہ "بے موجب" بولنا ...ر لکھنا اب قطعاً متروک ہے ؟

زباں ہے شکر میں قاصر شکستہ بالی کے　　　کہ جس نے دل سے مٹایا خلش رہائی کا (سودا)

...امر بھی غور طلب اور محتاج تحقیق ہے کہ کیا سودا کے زمانے میں خلش کو مذکر بولتے تھے ؟ دکن میں آج بھی "گھسنا"، بالفتح بولتے ہیں، سودا نے "قفس" اور جرس کے ساتھ "گھس" کا قافیہ باندھا ہے :

صیاد اب تو کیجیے قفس سے رہا ہمیں　　　ظالم پھڑک پھڑک کے پر و بال گھس چلے

دکن کے اس لب و لہجے (گھسنا) کے لیے ایک سند مل گئی!

آخر میں راقم الحروف ایک خاص امر کی جانب اہل ادب اور لغت نگاروں کو متوجہ کرنا چاہتا ہے کہ بعض الفاظ ایسے ہیں جو قدیم شاعروں اور نثر نگاروں کے یہاں استعمال ہوئے ہیں مگر اُردو میں اب ان کا چلن نہیں ہے۔ لیکن تقسیم ہند کے بعد بھارت میں جو سنسکرت زدہ ہندی بنائی گئی ہے، اس میں اردو کے بعض متروک الفاظ شامل ہیں، میرے خیال میں ایسے الفاظ اُردو لغت میں آنے چاہئیں! مثلاً خواجہ میر درد فرماتے ہیں:

اگر آئینہ چار آئینہ بھی ہوئے تو ہو سنمکھ ۔۔۔ سپر ہوں تیر مژگاں کا سو یہ میری ہی چھاتی ہے

ہندوستان کی قومی زبان ہندی میں "سنمکھ" بولتے ہیں، اور اب سے دو سو پونے دو سو سال پہلے خواجہ میر درد نے اس لفظ کو استعمال کیا تھا، لہذا اُسے اُردو لغت میں آنا چاہیے۔

میری گذارشوں کا محرک بلا وجہ کی بحث و تمحیص اور چھیڑ چھاڑ نہیں ہے، میں جو کچھ عرض کرتا رہا ہوں اُس کا مقصود لفظ و معنی کی صحت ہے، غلطیاں مجھ سے بھی ہوتی رہتی ہیں۔ میں اپنی واقعی غلطی پر مطلع ہونے کے بعد اصرار نہیں کرتا بلکہ اپنی غلطی کو مان لیتا ہوں۔

والسلام خیر اندیش

ماہر القادری

۲۷ اپریل ۷۷ ۱۹ء

حواشی

(۱) "اڑبنگا"، مولانا ماہر القادری کے زیر غور خط میں "اڑبنگا" کی تشریح تقریباً وہی ہے جو "اردو نامہ" میں شائع ہو چکی ہے اور اگر کوئی نکتہ رہ گیا ہو تو اضافے میں مضائقہ نہیں۔
"اڑبنگ" ٹیڑھا میڑھا کے معنوں میں عوام میں مستعمل ہے۔ مثلاً: راستہ اڑبنگ ہے۔ قدیم ہندی میں عیب اور انوکھا کا مطلب بھی ادا کرتا ہے۔

"بنگا" کا مطلب مولانا نے بانس، ڈنڈا وغیرہ لکھا ہے اور یہی صحیح ہے۔
"بنگا" کا مآخذ سنسکرت "بنگ" ہے جو بنگال یا بنگال میں پیدا ہونے والے ایک درخت کا مفہوم ادا کرتا ہے۔ پلیٹس اور ولیم کروک نے "بانس" ہی لکھا ہے۔
ایک اور لفظ "برنگا"، لکڑی کے شہتیر کا ہم معنی ہے اور یہ "بنگ" یا "بنگا" سے نکلا ہے۔ ورگ (س، ٹکڑا) سے نہیں جو پلیٹس میں درج ہے۔ (اختر حسین رائے پوری)

(۲) "انڈی"، مولانا ماہر القادری کا یہ خیال درست ہے کہ "انڈی" بہ رعایت کسرِ ر "ارنڈی" کا مخفف ہے۔
(اختر حسین رائے پوری)

انڈی اپنے مقام (صفحہ مسودہ ۲۲۵۶) پر درج ہے:
رک: ارنڈی جس کی یہ تخفیف ہے۔
جو الفاظ متروک یا شاذ ہیں وہ بھی درج کرنا ضروری ہیں، سند خود بتائے گی کہ یہ کس وقت رائج تھے۔ (نسیم امروہوی)

(۳) مصحفی کے عہد میں "فق ہونا" اور "فخ ہونا" دونوں رائج ہوں گے۔ اس امر میں خوش گمانی بہتر ہے۔

(۴) فرق بمعنی فراق اس مثال کی رو سے کم از کم اس عہد میں مستند قرار پاتا ہے۔

(۵) غالباً دوسرے مصرعے میں تھی کی جگہ "تھے" ہوگا، یعنی پہلے سراپا زبان تھے اب سراپا گوش ہو گئے۔

(۶) ہم اس کا فیصلہ اپنے زمانے کی حد تک تو کر سکتے ہیں۔ سابقہ عہدوں کی صریح سندوں کو نظر انداز کرکے کوئی حکم لگانا واجب نہ ہوگا۔

(۷) ایسے اور بھی لفظ ہیں جن کی تذکیر و تانیث میں فرق ہو گیا ہے اور بعض الفاظ بیک وقت دونوں طرح رائج رہے ہیں اور اب بھی ہیں۔

(۸) اردو جیسی وسیع علاقوں اور مختلف حلقوں اور طبقوں میں بولی جانے والی زبان کے لغات جس قدر بھی متنوع ہوں۔ تعجب کی بات نہیں۔ چنانچہ اس میں عربی و فارسی کی طرح سنسکرت کا بھی بڑا عنصر سمایا ہوا ہے جو ہندو مصنفین کی اردو کتابوں میں لازماً در آیا ہے (عام اس سے کہ اردو کے بہت سے الفاظ اصلاً سنسکرت ہیں)

شان الحق حقی

۱۴:۔ ۲۴ اگست ۱۹۷۴ء

جناب مکرم

السلام علیکم

تازہ ترین اُردو نامہ ملا، ایک ہی نشست میں پورا رسالہ پڑھ کر دم لیا، یہ اس کی دلیل ہے کہ آپ کے مجلۂ گرانقدر کے مضامین راقم الحروف کس قدر شوق و دلچسپی کے ساتھ پڑھتا ہے۔ اسی کا نام فیض و استفادہ ہے، اسی طرح چراغ سے چراغ جلتا ہے۔

ترقی اُردو بورڈ کی مرتب کردہ لغت میں "اڑکی اڑ" پڑھ کر میری محدود معلومات میں اضافہ ہوا، اس سے پہلے یہ ترکیب نہ تو کسی کی زبان سے سنی اور نہ کسی کتاب میں پڑھی، یہ ترکیب فوراً ازبر ہو گئی اور وجدان نے اس کو معاً قبول کر لیا، اپنی بے خبری کے احساس نے پندار پر بھرپور ضرب لگائی۔
مطالعے میں جو باتیں کھٹکیں اُن کا اظہار ضروری سمجھا گیا، مضمون نگار حضرات کے نام میں نے بالقصد نہیں لکھے ہاں! مضموں کے نام نمبر درج کر دیے ہیں۔

"حضرت یوسف کو دیکھ کر وہ عورتیں دنگ رہ گئیں اور آپ کے حسن سے اس قدر منفعل ہوئیں کہ ہاتھ کاٹ لیے" (صفحہ ۲۹)

یہاں "منفعل" کی جگہ "مبہوت" کا محل تھا۔

"اُردو نامہ شمارہ چھیالیسواں میں کچھ اعتراضات اُٹھائے ہیں" (صفحہ ۴۴) فاضل مضمون نگار نے "اعتراضات اُٹھائے" اعتراض کرنے اور اعتراضات جڑنے کے معنیٰ میں استعمال کیا ہے۔ حالاں کہ "اعتراض اٹھانا" معترض کے شبہ اور اعتراض کو رفع کرنے اور نکتہ چینی کے جواب دینے کو کہتے ہیں

"جس کی مبتدا کا سراغ نہیں ملتا" (صفحہ ۷۱)

"مبتدا" مذکر ہے "جس کی ابتدا" لکھتے تو یہ سقم پیدا نہ ہوتا۔

"اب ایک ایسا عمل ترکیبی جو ہیئت نامیہ کے منتشر رجحانات میں ربط قائم کرتا ہے" (صفحہ ۷۰)

یہ جملہ غالباً عربی کی کسی عبارت کا ترجمہ سا معلوم ہوتا ہے "ہئیت نامیہ" اور پھر اُس کے "منتشر رجحانات" اظہار مفہوم میں ژولیدگی پیدا ہو گئی، ایسے موقعوں پر بات پھیلا کر بیان کرنی چاہیے۔

"میں ڈیڑھ سو من کر حیرت میں ہوئی" (صفحہ ۹۴)

"حیرت میں ہوئی" محل غور ہے: "ڈیڑھ سو من سن کر مجھے بڑا اچنبھا ہوا یا حیرت ہوئی" یا "میں حیرت میں پڑ گئی" کا موقع تھا۔ ادیبوں اور شاعروں کے ان تسامحات کو بعد کے لوگ سند میں پیش کرتے ہیں!

"سیمل کی روئی کا بن تھا" (صفحہ ۹۴)

سیمل کا بن تھا نہ کہ سیمل کی روئی کا! دکن میں "سیمل" بولتے ہیں اور پلیٹس نے بھی یہ املا درج کیا ہے، مگر فصیح تر اور عام املا "سینبھل" (ن، ب اور ہائے ہوز کے ساتھ ہے)۔

"در بہشت میں فکِ اضافت تو نہیں؟ جو مٹھائی کے لئے مناسب نام ہے"۔ (صفحہ ۱۰۳)

اس میں "صاحبدل" کی طرح فکِ اضافت نہیں ہے "در بہشت" بڑا پیارا نام ہے، یعنی ایسی مٹھائی جسے کھاتے ہوئے ایسا محسوس ہو جیسے بہشت میں بیٹھے ہوتے ہیں! تقسیم ہند سے قبل رام پور کی

ایک دعوت میں راقم الحروف کے کام و دہن " در بہشت " سے لطف اندوز ہو چکے ہیں۔ میزبان نے خاص طور سے بتایا کہ نواب حامد علی خان سابق والیٔ ریاست رام پور کے رکاب دارنے " در بہشت " تیار کی ہے۔ مگر پاکستان میں بعض مٹھائیاں مصنوعی گھی اور ملاوٹ کی وجہ سے " در بہشت " نہیں " در جہنم " کہے جانے کی مستحق ہیں!

صفحہ ۱۱۵ پر :- " رتالو (شکر قند) "

شکر قند یا شکر قندی رتالو کو نہیں کہتے، رتالو تو اروی کی ایک قسم ہے، حجم میں رتالو اروی سے زیادہ بڑا اور وزنی ہوتا ہے اسے ترکاری کے طور پر پکاتے ہیں اور شکر قند کو اُبال کر یا گرم راکھ میں جھلسلا کر کھاتے ہیں۔ ہاں! اس سلسلے میں آپ سے پھر گذارش کروں گا کہ پلیٹس اور دوسری لغات کی تقلید میں آپ ترقی اُردو بورڈ کی لغت میں " اروی " کو جڑ نہ لکھیے ہرگز نہ لکھیے! اروی کو ترکاری لکھیے جو آلو اور شلجم کی طرح زمین کے اندر مٹی میں پیدا ہوتی ہے۔ ترقی اُردو بورڈ کی لغت سے ہم توقع رکھتے ہیں کہ سابقہ لغات کی غلطیوں کی تصحیح کرے گی اور الفاظ میں بہت کچھ اضافہ بھی۔

" چڑیا اور کتیا تو تصغیر ہیں، گدھیا تصغیر ہی کے طور پر بولا جاتا ہے " (صفحہ ۱۲۰)

یہ درست ہے کہ " کتیا " تانیث ہے تصغیر نہیں ہے مگر کتے کی تانیث " کتی " بھی ان کانوں نے سنا ہے یہی صورت گدھیا کی ہے (۱) کہ " گدھی " بھی " گدھے " کی تانیث ہے اور " گدھیا " بھی! اسی طرح گدھی اور گدھیا دونوں گدھے کی تانیث ہیں! اگرچہ ضرب المثل یوں ہے :

" تو گدھی کمہار کی، تجھے رام سے کیا کام " مگر دوآبہ کے بعض اضلاع بلکہ بہت سے ضلعوں میں " گدھے " کی مادہ کو تصغیر نہیں تانیث کے طور پر " گدھیا " (ی پر تشدید) بولتے ہیں، ایک اور کہاوت ہے :

" تال میں تال بھوپال تال باقی سب تلیاں رانی میں رانی پدمنی باقی سب گدھیاں "

" تلیا "، تو بے شک " تال "، (تالاب) کی تصغیر ہے مگر اس کہاوت میں " گدھیاں " گدھیا کی جمع ہے جو مصغّر نہیں مونث ہے۔

میں نے اپنے خط میں مصحفی کا شعر درج کیا تھا جس میں " چنخ " کا قافیہ " فنخ " کیا گیا ہے۔ یعنی قافیہ کی ضرورت کے سبب فق کو فنخ بنا لیا۔ میرے خط کے بعد حاشیہ میں جواباً لکھا گیا " مصحفی کے عہد میں " فق ہونا " اور " فخ ہونا " دونوں رائج ہوں گے "۔ حضرت یہ " ہوں گے " کیا؟ تحقیق کے بعد اس کی مثالیں لکھنی تھیں (۲)! فق کا قافیہ فخ اور خندق کا قافیہ اندک، اُردو میں یہ قافیہ کا عیب ہے جس کا نام " اکفا " ہے، اسی طرح خبیث کا قافیہ خسیس بھی عیب ہے جسے " اجازہ " کہتے ہیں! محل کا قافیہ بلبل، قافیے کے اس عیب کو " اقوا " کہتے ہیں! مگر عربی شاعری میں منزل، مشعل اور قتل ایک ہی

نظم میں باندھتے ہیں۔ عربی عروض شاعری میں اختلاف توجیہہ جائز ہے۔
مشاہیر و اسلاف ادیبوں اور شاعروں کی غلطی کی توجیہہ و تاویل ہو جائے تو بڑی اچھی بات ہے، لیکن اُن کی ہر غلطی کی تائید و توثیق کی کوشش اور ضرورت سے زاید خوش گمانی تحقیقی انداز نگر نہیں ہے۔

" اڑھیا " (صفحہ ۷۹۲) اس کے معنی " ڈھائی سیر کا باٹ " بالکل ٹھیک لکھے ہیں، مگر ساتھ ہی " ڈھیا " بھی لکھنا چاہئے تھا، پنسیری اور ڈھیا بولنے ہی کا زیادہ تر رواج ہے!

" از ماست کہ بر ماست " کی تشریح یوں کی گئی ہے :

" یہ سب کچھ اپنے ہی برے فعلوں کا نتیجہ ہے " (صفحہ ۸۰۰)

" برے فعلوں " کے مقابلے میں " کرتوتوں " موزوں تر لفظ ہے!

میں نے اپنے خطوں میں بارہا عرض کیا ہے کہ مشاہیر کی غلطیاں شعر و ادب میں سند نہیں بن سکتیں اور یہی وہ مواقع ہیں جہاں مرتبین لغت کی لغت دانی کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ صفحہ ۸۱۱ پر یہ عبارت نظر آئی :

" سوشلزم، کمیونزم یا کوئی بھی ازم ہو وہ فطرت سے جنگ کر رہا ہے "

(مضامین مولانا عبدالماجد دریا بادی)

" ازم " (ISM) بالاتفاق مذکر ہے، اس سے اوپر علامہ اقبال کے خط کی جو عبارت سند میں نقل کی گئی ہے اُس میں علامہ نے " ازم " کو مذکر ہی لکھا ہے! سوشلزم، کمیونزم، ڈاروِنزم وغیرہ سب مذکر ہیں، کیوں کہ " ازم " مذکر ہے، مولانا عبدالماجد دریا آبادی نے " سوشلزم " کو جو مونث لکھا ہے، یہ اُن کا تسامح ہے اور تسامح ہرگز ہرگز سند نہیں بن سکتا (۳)

" اژگر۔ رک اژدر " (صفحہ ۸۱۷)

اردو (اور ہندی) میں " اجگر " اژدہے کو کہتے ہیں، میرے خیال میں " اژگر " تلفظ اور املا میں " اجگر " سے زیادہ قریب ہے :

" اَس .... رک، آس پاس جس کا یہ جزو اول ہے " (۸۱۷)

نیر نہ کہیں اَس نہ پاس   نہروں بروں لاکے پیاس   (نوسر ہار)

اُردو میں " اَس " آس " جگہ کے معنی میں " کوئی لفظ نہیں ہے، میرا تو یہ خیال ہے کہ شاعر نے مصرع کا وزن پورا کرنے کے لئے " آس " میں تصرف کر کے " اس " بنایا ہے، یہ تصرف اس قابل نہ تھا کہ لغت میں اس کا ذکر آتا! یا پھر تحقیق کرنی تھی کہ اُس دور کے شعر و ادب میں کیا " آس " کے معنی میں " اَس " کہیں ملتا ہے! تحقیق و ریاضت کے یہی مقامات ہوتے ہیں (۴)! تصرفات جو مزدور

شعری کے لئے کئے جاتے ہیں، زبان اور روزمرہ نہیں بن سکتے! پاس کے ساتھ آس کی بجائے "اَس" نہ کانوں کو بھلا لگتا ہے اور نہ پڑھنے اور لکھنے میں! ہاں! "مُلخ" کے قافیہ میں "شاخ" کو جو "شَخ" شیخ سعدی نے باندھا ہے یہ حسین تصرف ہے!

میں نے اپنے خط میں جرأت کا ایک شعر درج کیا تھا، جس میں اُنہوں نے "اوسان" کو واحد نظم کیا ہے، اوسان، حواس، ستو وغیرہ الفاظ جمع بولے جاتے ہیں "جرأت" نے قافیہ کی مجبوری کے سبب اوسان" کو واحد نظم کر دیا۔ تو کیا جرأت کے اس شعر کو "اوسان" کے واحد ہونے کی سند میں پیش کیا جائے گا! افہم فتدبّر۔

"اس" (صفحہ ۸۱۷) کے سلسلے میں "اس طرح" اس صورت، اور "اس طور" آنے سے رہ گئے۔ اور "اس اُس" کا چھوٹنا تو افسوسناک ہے۔

"مجھے اس اُس سے کیا غرض تم سے کام ہے"

"اس اُس" کے معنیٰ ہیں:

"ایرے غیرے دوسرے لوگ، غیر لوگ، زید بکر ....."

ناموں کے بھی لطیفے ہیں۔۔ کوڑے خاں، گل از باغ علی، ظالم سنگھ، گھسیٹے میاں، جھگو، پھندن خاں، بیار محمود ..... اُردو نامہ میں "حمل خاں لغاری" (صفحہ ۵۱) پڑھ کر ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ آگئی، اور ناموں کے لطیفوں میں ایک مزیدار لطیفہ کا اضافہ ہو گیا۔

تازہ ترین اُردو نامہ میں جو میرا خط چھپا ہے اُس میں "خیرات" کی بحث آئی ہے کہ خواجہ میر درد نے "خیراتیں" نظم فرمایا ہے! خیرات عربی لفظ ہے خَیر کی جمع (بھلائیاں اور نیکیاں) مگر اُردو میں خیرات صدقہ کے معنی میں بولتے ہیں:

"کیا یہاں کوئی خیرات بٹ رہی ہے"

اور "خیرات" واحد ہی بولا جاتا ہے، میر درد کے اس تصرف (خیراتیں) کو قبول نہیں کیا جائے گا۔ (۵)

"خیرات زکوٰۃ" بھی روزمرہ ہے:

اپنے نیاز نامہ میں راقم الحروف نے دو شعر "حضور" کے سلسلے میں درج کیے تھے، ایک امیر مینائی کا دوسرا خواجہ میر درد کا، جس میں انہوں نے محبوب کو "بندہ نواز" سے خطاب کیا ہے۔ مگر ٹائپ میں خواجہ میر درد کا نام رہ گیا، (صفحہ ۱۱۱) دونوں شعر اوپر تلے ٹائپ ہوئے ہیں جن کے بارے میں اس التباس کا قوی امکان ہے کہ دونوں شعر امیر مینائی کے ہیں:

اگر خود ستائی نہ سمجھی جائے تو عرض کروں فارسی کی مشہور غزل کا ایک شعر ہے: (۱)

صبح دم چوں رخ نمودی شد نماز من قضا ؎ سجدہ کے باشد روا چوں آفتاب آید بروں

مگر آفتاب نکلنے کے بعد سجدہ کرنا جائز ہے ہاں! جب سورج نکل رہا ہو تو سجدہ کرنے کی ممانعت آئی ہے۔ لیکن اس مصرعہ میں بڑے لطف کی بات یہ کہی ہے کہ ابھی رات باقی تھی مگر محبوب نے اپنا رخ روشن دکھا کر صبح کا سماں پیدا کر دیا اور شاعر کی نماز قضا ہو گئی کہ سورج نکلنے کے بعد نماز فجر کا وقت نہیں رہتا۔ یہ مبالغہ واقعے کے خلاف ہے مگر خاصہ لطف انگیز ہے۔ میری غزل کا مطلع ہے:

سورج نکل رہا تھا سویرا ہوا نہ تھا ؎ وہ ایسے وقت آئے کہ سجدہ روا نہ تھا

اسی غزل کا ایک اور شعر ہے:

یہ بے تعلقی کی اذیت کہ ہائے! ہائے ؎ اے دوست! دشمنی کا زمانہ برا نہ تھا

نواب میر عثمان علی خاں مرحوم فرمانروائے دکن نے ایک فرمان کے آخر میں "باقی خیریت ہے" تحریر فرمایا تھا میں بھی "باقی خیریت ہے" پر اس خط کو ختم کرتا ہوں۔ والسلام خیراندیش

ماہر القادری

حواشی

(۱) تشدید صرف تانیث کے لئے نہیں آتی تصغیر کے لئے آتی ہے، جیسے میّا، کنکیّا کبھی تحقیر یا تحسین کے لئے بھی۔ پڑھوّیا، کبھی پیار کے طور پر بھی بسّیا (باسی، بسنے والا) یعنی اس کے مفہوم میں جذبات کی آمیزش پائی جاتی ہے۔

(۲) مثال تو آپ کے سامنے ہے، البتہ آپ نے قیاس فرمایا کہ یہ تصرف ہے، ہمارے سامنے ت اور ط کے بدل کی اور بھی مثالیں ہیں۔ جیسے تڑتنا، تڑخنا، طباق، طباخ یہ ایک عمومی اور طبعی رجحان تھا جس پر خالص پسندوں نے بندش لگا دی۔

(۳) اس قسم کی سماعی تذکیر و تانیث بولنے والوں کے مذاق پر مبنی ہوتی ہے یا مماثل الفاظ کے اعتبار پر متعین ہو جاتی ہے۔ غالباً مولانا نے ازم کو ہیئت کے اعتبار پر مونث لکھا ہے۔ آپ "اسم" سے مماثلت کی بنا پر مذکر خیال کرتے ہیں۔

(۴) دکھنی کے معاملے میں وہی لوگ سند ہیں، ہم نہیں ہو سکتے۔ آس پاس کی اور بھی مثالیں ہیں، اور بعض دوسرے الفاظ میں بھی الف ممدودہ کو مقصورہ سے بدلا گیا ہے، مثلاً ایس (بجائے آیس)

(۱) چوں کہ آپ مخاطب ہیں اس لئے خط لکھتے لکھتے شاعری کی ہڑک اٹھی۔ (ماہر)۔

دکھنی میں بہت عام ہے۔ بلکہ ادمیان بجائے آدمیان بھی ہے۔ یہ اس دور کا عام رجحان تھا۔ تاریخی لغت کا فائدہ یہی ہے کہ ہر دور کے رجحانات کا پتہ چلتا ہے۔ ہم اپنے جدید مذاق پر اپنے ہی وقت میں اصرار کر سکتے ہیں۔

(۵) بے شک آپ کو حق ہے کہ آپ آج اس کی تقلید نہ کریں۔ لیکن لغت نگار ان تصرفات سے صرفِ نظر نہیں کر سکتے۔ یہ ایک کوتاہی ہو گی۔

شان الحق حقی

۱۵۔ ۱۵ اپریل ۷۵ء

مکرمی جناب حقیؔ صاحب۔ سلام و رحمت

اُس دن آپ کے دولت کدے پر شاعروں کا اجتماع خوب رہا۔ چائے کے ساتھ لوازمات بھی ذائقہ دار تھے، کام و دہن کی لذت کے ساتھ روحانی غذا سے بھی لطف اندوز ہونے کا موقع ملا۔ آپ کے خلوص کی چاشنی سونے پر سہاگا! دوست احباب کہیں مل بیٹھتے ہیں تو تھوڑی دیر کے لئے بہت سی فکروں اور غموں سے چھٹکارا مل جاتا ہے!

تازہ ترین "اردو نامہ" (پچاسواں شمارہ) میں اس کی ضخامت کے ساتھ ترتیب و تنوع اور مضامین کی رنگا رنگی قابلِ تحسین ہے۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق فرمایا کرتے تھے کہ ریلوے ٹائم ٹیبل کے مطالعہ سے بھی معلومات میں کچھ نہ کچھ اضافہ ہی ہوتا ہے ... علمی، ادبی اور فنی مقالات اور مضامین کے مطالعہ کی افادیت کا کیا پوچھنا!

ڈاکٹر ممتاز حسن مرحوم پر جو مضامین آئے ہیں، وہ اثر انگیز بھی ہیں اور معلومات افزا بھی! مرحوم کی زندگی اور فضل و کمال پر تو ایک کتاب آنی چاہیے۔ ممتاز حسن مرحوم کی ذات علم و ادب کی محفلوں کی رونق تھی۔

"اردو نامہ" میں جو مقامات راقم الحروف کو کھٹکتے ہیں، اُن کا ذکر اپنے خط میں کر دیتا ہوں اور آپ اپنی نوازش سے میرے خط چھاپ دیتے ہیں۔ سہو و خطا سے کوئی انسان محفوظ نہیں ہے، اسلاف و اکابر کے تسامحات کی اگر توجیہہ و تاویل ہو سکے تو یہ اچھی بات ہے مگر ان کی غلطیوں کو سند نہیں بنانا چاہئے میں پھر عرض کروں گا "کہ ازم" (ISM) بالاتفاق مذکر ہے مولانا عبدالماجد دریا بادی نے اسے جو مونث لکھا ہے وہ اُن کی غلطی ہے یا آپ نے جو تاویل اور توجیہہ کی ہے: "غالباً مولانا نے ازم

کو ہیئت کے اعتبار پر مونث لکھا ہے " وہ دل کو نہیں لگی۔ (۱) اردو میں "جر ثقیل" "سو ثقیل" سے پہلے کی اصطلاح ہے، اور اُسے مذکر ہی لکھا جاتا رہا ہے۔

میر درد نے "خیرات" کی جو جمع (خیراتیں) نظم کی ہے، یہ ان کا تصرف درست نہیں ہے۔ "خیرات" اردو میں مونث ہی بولا اور لکھا جاتا ہے۔ آپ نے اس سلسلہ میں تحریر فرمایا ہے:

" بے شک آپ کو حق ہے آپ آج اس کی تقلید نہ کریں، لیکن لغت نگار ان تصرفات سے صرفِ نظر نہیں کر سکتے۔ یہ ایک کوتاہی ہو گی"

میری گزارش ہے کہ زبان میں اکابر و اسلاف کے جن تصرفات کو جمہور نے قبول کر لیا ہے اور اُن کا چلن ہو گیا ہے، ظاہر ہے اُن تصرفات سے صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا، مگر جن تصرفات کو قبول نہیں کیا گیا تو اس قسم کی "غلطیوں" سے لغت نگاروں کو صرفِ نظر ہی کرنا ہو گا۔ کسی بڑے سے بڑے ادیب و شاعر کی غلطی سند نہیں بن سکتی! "محیط اُردو" میں آپ اس قسم کے تصرفات سے صرفِ نظر نہیں فرما سکتے، تو پھر یوں لکھنا چاہیئے:

" اردو میں خیرات کی جمع نہیں آتی مگر خواجہ میر درد نے خیراتیں نظم کیا ہے" (۲)

غیاث اللغات میں کہیں کہیں یہی انداز اختیار کیا گیا ہے، مثلاً زمانہ اور مدت کے معنی میں "قرن" کی "ر" ساکن ہے اور یہی صحیح ہے، مگر انوری نے اپنے قصیدے میں "قرن" کی "ر" کو متحرک (بر وزن چمن) نظم کیا ہے۔ صاحب غیاث اللغات نے اس کی تصریح کر دی ہے۔

اُردو نامہ کے صفحہ ۱۲ پر لکھا ہے:

" بادشاہ وقت کی نا اہلیت، کم توجگی اور کمزوری"

جس طرح غنچہ سے غنچگی اور زچہ سے زچگی مشتق ہے، اسی طرح توجہ سے "توجگی" نہیں توجہی بنتا ہے، صحیح "کم توجہی" ہے!

" سلطنت کی حد بندی محدود کر لی" (صفحہ ۱۵)

اس میں "محدود حشو و زائد ہے، "سلطنت کی حد بندی کر لی" پر بات ختم ہو جاتی ہے۔ (۳)

اہل دولت اور اہل حاجت میں ملاپ نہیں ہو سکتا" (صفحہ ۱۹۹) ملاپ کی جگہ "اتحاد" موزوں تر لفظ ہے (۴)

" دورہ جب اٹھتا اُن کو سخت تکلیف ہوتی" (صفحہ ۲۰۵) روز مرہ دورہ پڑتا ہے۔ درد اُٹھنا ہوک اُٹھنا، ہڑک اُٹھنا... بولنے کا رواج ہے۔ "دورہ اُٹھنا" بھی ممکن ہے محاورہ ہو مگر عام طور

"دورہ پڑنا" بولتے ہیں اور یہی فصیح تر ہے۔ (۵)

"انٹا غفیل" (صفحہ ۲۲۰) اس کے معنیٰ "بے خبر ہونا" لکھے ہیں۔ اس کے صحیح معنی نشہ میں چور، مست اور غافل (۶) ہونے کے ہیں۔ عام طور پر افیونیوں کے لئے یہ محاورہ بولا جاتا ہے، یوں :

"میر صاحب نے افیم کے ساتھ بالائی کھائی اور انٹا غفیل ہو گئے"

صفحہ ۲۴۸ پر "دھتا بتانے" کے معنیٰ "راستے سے ہٹا دینا" درج کئے ہیں جو قطعاً غلط ہیں "دھتا بتانے" کے معنیٰ ٹالنے اور رفو چکر کرنے کے ہیں۔ یہ محاورہ اس طرح بولا جاتا ہے :

"میں اپنے دوست سے قرض لینے کے لئے گیا تھا مگر اس نے مجھے دھتا بتائی اور میں وہاں سے اپنا سا منھ لے کر چلا آیا (۷)

"کنی دبا رہنا" مجبور ہو جانا (صفحہ ۲۳۱)۔ اس میں "رہنا" زاید اور غیر متعلق ہی نظر آیا۔ "کنی دبنا" لکھنا چاہیئے تھا، نور اللغات میں اس کے معنیٰ یوں لکھے ہیں :

"عاجز ہونا، مغلوب ہونا، جھینپنا، خائف ہونا، لکھنؤ میں کور دینا ہے۔"

"کنی دبنے" کا استعمال :

"گاؤں کے مکھیا سے تھانیدار کی کنی دبتی ہے"

یعنی تھانیدار مکھیا سے جھینپا جھینپا اور دبا دبا سا رہتا ہے اور اپنے موقف کی کمزوری کو محسوس کرتا ہے۔

"بساط الٹنا۔ ختم کرنا" (صفحہ ۲۳۵)۔ یہ محاورہ زیادہ وضاحت اور تشریح چاہتا تھا۔ اس محاورے کی مثال میں جو یہ فقرہ :

"وہ رنگ رلیاں اب کہاں، زمانے نے دلی کی بساط ہی اُلٹ دی"

درج کیا گیا ہے، اس میں "بساط اُلٹنے" کا استعمال تو صحیح ہوا ہے۔ مگر فاضل مضمون نگار نے اس محاورے کے جو معنیٰ لکھے ہیں، اُس کے لحاظ سے دلی ختم کب ہوئی تھی؟ اگر فاضل مضمون نگار کے لکھنے کے مطابق "بساط اُلٹنے" کے معنیٰ صرف "ختم کرنا" ہوں تو کیا یوں بول سکتے ہیں؟

"میں نے دو مہینہ کی شبانہ روز محنت کے بعد کتاب کی بساط اُلٹ دی"

اس مضمون کے متعدد الفاظ اور محاوروں کے معنیٰ محل نظر ہیں یعنی اقرب الی الصحت نہیں ہیں (۷)

"سرکہ جبیں ہونا"۔ "ترش رو ہو کر بولنا" (صفحہ ۲۲۹)۔ اس میں "بولنا" حشو و زاید ہے، "ترش رو ہونا" صحیح ہے۔ عربی میں "سرکہ جبیں" کو "عبس الوجہ" بولتے ہیں۔

"مہرہ پٹنا" کے معنیٰ اُمید منقطع ہونے اور سہارے ٹوٹ جانے کے نہیں ہیں (صفحہ ۲۳۵)۔

"سہارا ٹوٹ جانا"، تو کسی حد تک صحیح ہے مگر اُمید منقطع ہونا صحیح نہیں ہے۔
"شطرنج کی بازی میں میرے دو مہرے شروع ہی میں پٹ گئے"
"اُمید منقطع ہونا" کے معنی اس جملہ میں کسی عنوان فٹ نہیں بیٹھتے۔ ایک دوسرا جملہ:
"سپہ سالار نے بڑے بڑے سرداروں کو زیر کیا، اور جب یہ مہرے پٹ گئے تو اُس کے لئے میدان صاف ہوگیا"
اس جملہ میں "مہرے پٹنا" با اثر آدمیوں کے زیر کرنے کے معنی میں بولا گیا ہے۔
"پو بارہ ہونا" — کامران ہونا" (صفحہ ۲۳۶)۔ "کامران" کا یہاں استعمال عجیب سا لگتا ہے، اس محاورے کے معنی یوں لکھنا تھے:
"جیت ہونا، فایدہ ہونا، گہرے ہونا، قمار بازی میں جیت کا پانسہ پڑنا، مال ہاتھ لگنا (نور اللغات)
محاوروں کے معنی لکھتے وقت لغات بھی ضرور دیکھ لینی چاہئیں۔
"دور کی کوڑی لانا — اچھی چال چلنا" (صفحہ ۲۳۷)۔ اس محاورے کے معنی ہیں دور کی بات سوچنا۔ باریک بینی — غور و فکر سے اچھی تدبیر اختیار کرنا — یہ موقع و محل کے لحاظ سے طنز کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔
"بازی لڑنا — برابر کا کھیل ہونا" (صفحہ ۲۳۰)۔ "برابر" اس میں زاید اور غیر ضروری ہے۔ دو شخص بازی کھیل رہے ہوں، ایک اُن میں نو مشق ہو اور دوسرا مشاق ہو تو اُس کو بھی "بازی لڑنا" ہی بولا جاتا ہے حالانکہ ان دونوں کا برابر کا کھیل نہیں ہے۔
"اڑنگی مارنا — داؤں چلانا"۔ (۸) ہم نے تو "اڑنگا" سنا اور پڑھا ہے، فاضل مضمون نگار نے کتاب میں جملہ درج کیا ہے:
"یار! میرے کام میں اڑنگی مت مارو" (صفحہ ۲۳۷)
اس میں "داؤں چلانا" کے معنی کہاں نکلتے ہیں؟ "اڑنگا مارنا یا اڑنگا لگانا" کے معنی ہیں کام میں رکاوٹ پیدا کرنا اور کھنڈت ڈالنا۔
"رسّی پڑنا" — خاموش ہونا۔ "حریف کا کوئی پتنگ نہیں بڑھا، معلوم ہوتا ہے رسّی پڑ گئی" (صفحہ ۲۴۲)۔ یہ جملہ صحیح نہیں ہے۔ "پتنگ نہیں بڑھا" سے شاید مخالف پتنگ باز کا پتنگ نہ اُڑانا یا نہ بڑھانا مراد ہو مگر "رسّی پڑ گئی" کو "خاموش ہونا" کے معنی سے آخر یہاں کیا مناسبت ہے؟
"شہ سے بچنا — مصیبت سے بچنا" (صفحہ ۲۴۵)۔ یہ معنی درست نہیں ہیں۔ مثال میں یہ جملہ درج

فرمایا گیا ہے :

"دوسروں کی کیا شکایت اب تو اپنوں کی شہ سے بچنا ہے"

یہاں شہ کے معنی ہیں وار اور حملہ سے بچنا۔

سرائیکی	سندھی	اُردو
ندیاں	ندیوں	نہریں (صفحہ ۲۸۶)

اردو زبان میں "ندی" نہر کو نہیں دریا (RIVER) کو کہتے ہیں جو قدرتی ہوتی ہے اور (CANAL) نکالی اور بنائی جاتی ہے۔

"اٹھاؤ چولھا" کے معنی فضول خرچ آدمی کے نہیں ہیں (صفحہ ۴۴۸)۔ "اُٹھاؤ چولھا" ایسے آدمی کو کہتے ہیں جو مستقل مزاج نہ ہو اور ایک جگہ ٹک کر نہ رہ سکے۔ میرے خیال میں "محیط اردو" کے مرتبین نے "فضول خرچ" کے معنی نہ لکھ کر کوئی کوتاہی نہیں کی۔ فاضل ناقد کو سند دینی چاہیئے تھی۔

"ٹیڑھی حویلی" میں ڈاکٹر اشرف کے بارے میں لکھا ہے :

"ان کی شاعری بھی قابل ذکر ہے" (صفحہ ۱۶۵)

ڈاکٹر اشرف الحق مرحوم سے راقم الحروف کی بلدہ حیدر آباد میں بارہا ملاقاتیں رہی ہیں، عریاں تخلص کرتے تھے، ان کا مجموعہ کلام میں نے پڑھا ہے، اس میں عریانیت تو حد سے زیادہ ہے مگر رفیع احمد خاں کی فحش شاعری کی طرح زبان و بیان اور خیال کا لطف اور چٹخارہ نہیں ہے۔ شاہد احمد دہلوی (مدیر "ساقی") نے عریاں کے دیوان کو پرنٹر اور پبلشر کے نام کے بغیر چھپوایا تھا۔ ڈاکٹر اشرف الحق نے راقم الحروف کو بھی خوب خوب بے نقط سنائی ہیں، اور ماہر القادری کو ماہر الپادری بنا کر "تنابز بالالقاب" کا ارتکاب کیا ہے۔ بعض اوقات بعض شخصیتوں کے بارے میں اکابر و مشاہیر کی رائیں مبالغہ آمیز اور غلط فہمی میں ڈالنے والی ہوتی ہیں۔

محمد امیر خاں راجہ محمود آباد پر "اُردو نامہ" میں جو مضمون آیا ہے اُس میں بعض واقعات درست نہیں ہیں۔ مثلاً صفحہ ۱۵۸ پر راجہ محمود آباد مرحوم کے اتالیق اور اساتذہ میں میر نفیس کا نام دیا ہے، حالانکہ میر نفیس، میر انیس کے فرزند تھے اور راجہ محمود آباد کے دادا امیر الدولہ راجہ امیر حسن خاں کے شاعری میں استاد تھے اور راجہ محمود آباد کی ولادت سے پندرہ برس پہلے وفات پا چکے تھے۔

"قائد اعظم جناح ... اور سبھاش چندر بوس کو بھی ان کی تحریک کے لئے روپیہ دیا" (۱۶۰)

راجہ محمود آباد امیر احمد خاں کے والد مہاراجہ محمود آباد تو ۱۹۳۱ء یا ۱۹۳۲ء میں فوت ہو چکے تھے، اس وقت پاکستان کی تحریک کہاں شروع ہوئی تھی جس کے لئے قائد اعظم کو وہ روپیہ دیتے؟ سوبھاش چندر بوس کی تحریک کا اُس زمانے میں سرے سے کوئی وجود ہی نہ تھا۔ سوبھاش چندر بوس کی انڈین نیشنل آرمی (I.N.A) کی تحریک دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں مہاراجہ سر علی محمد خاں والیٔ محمود آباد کی وفات کے کئی برس بعد وجود میں آئی۔ سوبھاش چندر بوس سے مہاراجہ محمود آباد کا کوئی رابطہ نہ تھا اور ہوتا بھی تو وہ انگریزی حکومت کے خلاف ایسی باغیانہ تحریک کے لئے امداد دینے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔

یہ بات بھی صحیح نہیں ہے کہ کانگریس کو چھوڑ کر مولانا محمد علی مسلم لیگ میں شامل ہو گئے تھے۔ (صفحہ ۱۶۰)۔ مولانا محمد علی مرحوم کی وفات کے زمانے تک مسلم لیگ مسلمانانِ ہند کی عوامی جماعت نہیں بنی تھی اور مولانا محمد علی جوہر راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں مسلم لیگ کے نمائندے کی حیثیت سے شریک نہیں ہوئے تھے۔ اس کے بعد ان کا انتقال ہو گیا اور بیت المقدس میں دفن ہونے کی سعادت حاصل ہوئی۔ ؎

سوئے گردوں رفت زاں راہے کہ پیغمبر گذشت (اقبال)

اسی مضمون میں لکھا ہے:

"راجہ صاحب کا قائد اعظم کے ساتھ شامل ہونا ایک اور معنی میں بھی بہت بڑا قدم تھا" قدم کا نہیں "اقدام" کا محل و مقام تھا۔

"انہوں نے سیاست میں کھلم کھلا حصہ لے کر اپنے طبقہ کی یہ حد توڑ دی۔ انگریز گورنر اس قدم کی اہمیت سمجھ گیا کہ یہ تو ایک نیا شوشہ ہے، اُس نے نوعمر راجہ کو بلا کر ایک طرف تو ریاست ضبط کرانے کی دھمکی دی اور دوسری طرف خطابات وغیرہ کا لالچ دیا" (صفحہ ۱۶۰)

اُس زمانے میں یوپی کے گورنر سر میلکم ہیلی نے راجہ محمود آباد کو یہ مشورہ دیا تھا کہ انہیں قومی کاموں ہی میں حصہ لینا ہے تو زمینداروں کی تنظیم میں شامل ہو جائیں، مگر جائداد ضبط کرنے کی دھمکی دینے کا واقعہ صحیح معلوم نہیں ہوتا کیونکہ برطانوی حکومت نے کسی مسلم لیگی لیڈر کو گرفتار کر کے قید و بند میں نہیں ڈالا اور مسلم لیگ کو انگریز کانگریس کی طرح اپنے اقتدار کے لئے زیادہ خطرناک نہیں سمجھتا تھا۔ مسلم لیگ خدانخواستہ ہندوستان کی آزادی کی مخالف نہیں تھی مگر اُس کا دوبدو سامنا اور اصل مقابلہ کانگریس اور ہندو قوم سے تھا۔ یہ بات الم نشرح ہے کہ "QUIT INDIA" (انگریزو ہندوستان چھوڑ دو) کا ریزولیوشن کانگریس کمیٹی نے پیش کیا تھا جس کی پاداش میں کانگریس

کے بڑے بڑے لیڈ ادھر لیڈ گئے۔ ہاں ۱۹۴۶ء میں قائد اعظم نے مسلم لیگ کے سربراہ کی حیثیت سے انگریزی حکومت کے خطابات واپس کرنے کا حکم دیا اور متعدد خطاب یافتہ مسلمانوں نے خطابات واپس کردیئے یہ وہ زمانہ تھا جب انگریز کے چل چلاؤ کا وقت تھا، مشہور مزاح نگار شاعر احمق پھپھوندوی نے اپنی رباعی میں کتنی بھرپور طنز کی :

جاتے جاتے بھی دے رہے ہیں خطاب ؛ گرچہ حضرت ایک کے چھوٹی ہے

سمجھیں اس کو غنیمت اہل وفا ؛ بھاگتے بھوت کی لنگوٹی ہے

مولانا حسرت موہانی برطانوی حکومت کے انتہائی مخالف تھے، انہوں نے احمق پھپھوندوی کی اس رباعی کو بعض جلسوں میں سنایا، لوگ سمجھے کہ یہ رباعی مولانا حسرت کی ہے :

" انتقال سے چند سال قبل وہ اسلامی مرکز لندن کے ثقافتی ڈائرکٹر مقرر ہوئے تھے تو پاکستان کی حکومت نے انہیں "ہز اکسلنسی کا خطاب اور سفیر کا عہدہ دیا (صفحہ ۱۶۱)

جولائی ۱۹۶۹ء میں راقم الحروف راجہ صاحب سے لندن میں ملا تھا اور اسلامی مرکز کے ہال میں میری تقریر بھی ہوئی تھی۔

" ہز اکسلنسی " کے، سی، ایس آئی اور او۔ بی۔ ای کی طرح کوئی خطاب نہیں تھا۔ اس لقب اعزاز کا تعلق عہدے سے تھا۔ انگریزی دور میں، وائسرائے، کمانڈر انچیف اور گورنروں کے ناموں کے ساتھ ہز اکسلنسی لکھا جاتا تھا، اور لفٹنٹ گورنروں کو ہز آنر۔ ہندوستانی ریاستوں میں حکومت دکن کے صدر اعظم مہاراجہ سرکشن پرشاد یمین السلطنت کے نام کے ساتھ بھی ہز اکسلنسی لکھا جاتا تھا۔ جب یہ لوگ ان عہدوں سے سبکدوش ہو جاتے تو پھر یہ القاب (ہز اکسلنسی اور ہز آنر) اُن کے ناموں کے ساتھ نہیں لکھے جاتے تھے۔ کونسل آف اسٹیٹ کے عہدوں کے ناموں کے ساتھ "آنریبل" لکھنے کا رواج تھا۔ راجہ محمود آباد کو حکومت پاکستان نے کسی بیرونی ملک میں باضابطہ سفیر نہیں بنایا تھا، اور نہ اُن کے نام کے ساتھ "ہز اکسلنسی"، لکھا گیا۔

" ۱۹۴۷ء کے فوراً بعد ہی سے پنڈت نہرو اور مسز نائیڈو خاص طور سے یہ چاہتے تھے کہ راجہ صاحب لکھنؤ میں مستقل سکونت پھر سے اختیار کریں۔ (صفحہ ۱۶۲)

مگر ۱۹۴۷ء میں یا اس سے پہلے راجہ صاحب مرحوم نے ہندوستان کی سکونت کو کب چھوڑا تھا، وہ تو حیدر آباد دکن پر حکومت ہند کی فوج کشی اور قبضہ کے بعد پاکستان ہجرت کرکے آئے تھے۔ یہ واقعہ ۱۹۴۸ء کے آغاز کا ہے۔

" اس لئے کہ حسن صورت و سیرت کی تربیت کے ساتھ ساتھ ... (صفحہ ۱۶۲)

سیرت کی تربیت تو ہوتی ہے ۔ مگر سورت یا حسن صورت کا تربیت سے کوئی تعلق نہیں ہے، ہاں حسن اور جسمانی صحت کی نگہداشت کی جاتی ہے ۔

اُردو نامہ کے حصہ لغت میں "اساڑھی" (صفحہ ۸۲۹) کے یہ معنی لکھنے سے رہ گئے:

"وہ زمین جسے ربیع کی فصل کے لئے جوت کر تیار کیا جاتا ہے"

صفحہ ۸۶۷ پر استبدادیت کے معنی میں "شخصی حکمرانی اور جابری لکھا ہے۔ اردو میں ظالم سے ظالمی اور جابر سے جابری مشتق نہیں ہوا اور اس کے بولنے اور لکھنے کا رواج نہیں رہا۔

صفحہ ۸۴۳ پر "اسبال" کے معنی "لٹکانا، لٹکا ہوا ہونا" صحیح لکھے ہیں۔ تو یہاں میں مندرجہ ذیل عبارت بڑھا دی جائے تو مفہوم و معنی کے عام پہلو واضح ہو جائیں گے:

"تہمد یا ازار کو اس طرح لٹکانا کہ ٹخنے چھپ جائیں اور تکبر و نمود کا انداز پیدا ہو جائے"

"اردو املا" پر ڈاکٹر فرمان فتحپوری کا مضمون خوب ہے، اُن کے مضمون چھپنے سے کئی مہینے قبل رشید حسن خاں صاحب کی ضخیم کتاب منظر عام پر آ چکی ہے۔ "فاران" میں اس کتاب پر میرا تبصرہ شاید آپ کی نظر سے گزرا ہوگا۔ فرمان صاحب کے مقالہ کے بعض حصوں کا "اردو املا" کے مضامین سے توارد ہو گیا ہے (۹)

مجھے اس سلسلے میں مختصراً یہ عرض کرنا ہے کہ تقسیم ہند سے قبل انجمن ترقی اردو نے املا کے سلسلہ میں جو تجویزیں پیش کی تھیں اُن میں سے متعدد تجویزوں کو اردو دنیا کے عوام و خواص نے قبول نہیں کیا۔ مثلاً گاؤں اور پاؤں ہی لکھنے کا رواج ہے، گانو اور پانو کو قبول عام حاصل نہیں ہوا۔ اسی طرح عیسا اور موسا کوئی نہیں لکھتا عیسٰی اور موسٰی ہی لکھا جاتا ہے۔ کم و بیش ڈیڑھ سو برس سے ڈاک کے کارڈوں پر "ٹپہ" بھی لکھا جا رہا ہے۔ طے طوطا بھی بولتا ہے اور طوطی بھی بولتی ہے۔ پھر حرف "ط" کی لکھاوٹ میں طوطے کی شکل سے مشابہت پائی جاتی ہے، ہندو جن کے نام طوطا رام اور طوطا سنگھ ہے وہ بھی اپنے نام "ت" سے نہیں "ط" ہی سے لکھتے تھے۔ جس طرح بولنے میں "غلط العام" کا رواج ہے اسی طرح اردو املا میں بھی "غلط العام" کو صحیح سمجھنا چاہیئے۔

مثلاً عربی میں "اش اش" ہے مگر اردو والوں نے اس کا املا "عش عش" کر دیا ہے اور اسی کا رواج ہے۔ فارسی اعتبار سے "غلطیدن" غلط اور "غلتیدن" صحیح ہے مگر "گوہر غلطاں" کے مقابلہ "گوہر غلتاں" کس قدر عجیب اور کم حیثیت لگتا ہے!

جس طرح بولنے میں مونث و مذکر کا اختلاف ملتا ہے اسی طرح اردو املا میں بعض الفاظ دو طرح لکھے جاتے ہیں۔ کوئی قباحت نہیں ہے۔ نقشہ اور نقشا، موقع اور موقعہ، پڑاتا اور پڑاف، تنباکو اور تمباکو، منہدی اور مہندی، چھ اور چھے، خورد و کلاں اور خرد و کلاں، قصائی اور قسائی، مولانا اور مولنا، دنیوی اور دنیاوی، راجہ اور راجا، کرور اور کروڑ، دولہن اور دلہن جیسے الفاظ کا املا دونوں طرح

صحیح ہے۔ ہاں، جمہور ان الفاظ میں املا کی یکسانی کو قبول کر لے تو اس کا خیر مقدم کیا جائے گا۔ دو رنگی کے مقابلے میں یک رنگی اچھی چیز ہے بشرطیکہ اُس کو قبول عام حاصل ہو جائے۔

ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے رضائی کے لئے رائے دی ہے کہ، اسے "رزائی" لکھنا چاہیئے (صفحہ ۱۶۱)
"رضائی"، مروج و معروف املا ہے، اس کے بدلنے کی کیا ضرورت لاحق ہوئی ہے۔ جس طرح گھی میں پکی ہوئی روٹی کو باقر خاں نام کے کسی شخص نے ایجاد کیا اور وہ موجد کے نام پر "باقر خانی" کہلائی، اسی طرح رضا نام کے کسی خوش ذوق نے اوڑھنے کے اس کپڑے کو ایجاد کیا ہو گا اور وہ "رضائی" مشہور ہو گئی

ڈاکٹر صاحب کے کتنے ہی مشورے صائب ہیں۔ مثلاً انہوں نے لکھا ہے:

"ایسی صورت میں مناسب یہی ہے کہ ان کا مروج املا گاؤں، پاؤں، چھاؤں، داؤں ہی برقرار رکھا جائے"، (جزاک اللہ)

خط طویل ہو گیا مگر کیا کیا جائے جو باتیں ضروری سمجھی گئیں اُن کا اظہار بھی ضروری تھا

والسلام

مخلص ماہر القادری۔ مدیر (فاران)

حواشی

(۱) میری مراد "ہیئت" سے نہیں لاحقہ "ہیت" سے تھی جو ہمارے ہاں "ازم" کا بدل ہے اور اس سے جتنے اسم بنتے ہیں مونث ہیں۔

(۲) مذاق عہد بعہد بدلتا بھی ہے۔ جو تصرفات اب پسند نہیں کئے جاتے ان کو بہر حال حوالہ و سند کے ساتھ درج کر دینا لازم ہے۔ اس پر حکم لگانا ضروری نہیں۔ یہ بات خود ہی واضح ہو گی کہ کس زمانے کی مثال ہے۔ بعض اوقات انسان اپنے مذاق پر قبول عام گمان کر لیتا ہے۔ رائے عامہ سے استصواب کہاں کیا جاتا ہے۔

(۳) آپ کا فرمانا بجا ہے۔ یہاں عبدالرحمان چغتائی صاحب سے سہو ہوا۔

(۴) یہ انفرادی اسٹائل کا معاملہ ہے، لفظ دونوں صحیح ہیں۔

(۵) ہمیں بھی دورہ اٹھنا کی کوئی سند نہیں ملی۔

(۶) غفیل کا مادّہ وہی ہے جو غافل کا، اور انطاغفیل کے معنی ظاہر و باہر۔

(۷) بیشک، صاحب مضمون نے اپنی تشریحات میں صرف معنی کی طرف سرسری اشارات کئے ہیں۔ لغت میں معنی کا اندراج جس احتیاط سے کرنا ہوتا ہے غالباً وہ احتیاط اس مضمون میں ضروری خیال نہیں کی گئی۔

(۸) اڑنگی کی کوئی سند ہمیں بھی نہیں مل سکی۔ ہمیں عموماً آپ کے تبصرے سے اتفاق ہے۔ جو آپ نے بعض مضمون نگار اصحاب کی تحریر پر کیا ہے۔

(۹) فرمان صاحب کا مضمون بھی کچھ عرصے پہلے کا لکھا ہوا ہے۔ توارد تو لازمی تھا کیوں کہ مسائل ایک ہیں اور ان پر جو کچھ کہا ہے وہ بھی دو معاصر اور ہم خیال حضرات نے کیا ہے۔ ہم نے دونوں سے استفادہ کیا ہے

شان الحق حقی

۱۶۔ بکم جنوری ۷۶ء

جناب مکرم

السلام علیکم

سال نو پر مبارک باد دینے اور لینے کو جی نہیں چاہتا:

لفظ سکتے میں ہیں، معنیٰ مضطرب — کتنی مشکل میں لب اظہار ہے (راقم الحروف)

تازہ ترین اُردو نامہ (شمارہ ۵۱) ملا۔ اس کے مضامین سے استفادہ کیا۔ شکر گزار ہوں کہ آپ نے راقم الحروف کا طویل خط شائع فرمایا۔ میرے اس خط میں ٹائپ کی بعض غلطیاں رہ گئی ہیں۔ میں یہ بات از رہ شکایت نہیں کہہ رہا ہوں، میرے رسالہ "فاران" میں کتابت کی غلطیاں رہ جاتی ہیں۔ حالانکہ میں کاپیوں کو تین تین بار پڑھتا ہوں۔

۱۔ صفحہ ۱۷۳ "کونسل آف اسٹیٹ کے عہدوں"۔ "ممبروں" اصل مسودے میں ہوگا۔

۲۔ رابعہ صاحب محمود آباد کی ہجرت کے سلسلے میں ۱۹۴۸ (صفحہ ۱۷۴) ممکن ہے میرے ہی قلم کی لغزش ہو۔ "۱۹۴۸ء کے اختتام یا ۱۹۴۹ء کے آغاز" ہونا چاہیئے۔

۳۔ "ط سے طوطا بھی بولتا ہے (صفحہ ۱۷۴)۔ اس جملے سے پہلے کی عبارت ٹائپ ہوتے سے رہ گئی۔ مسودے کی نقل میرے پاس نہیں ہے۔ اب میں اپنے مفہوم کی وضاحت کرتا ہوں تاکہ بات مبہم نہ رہے۔ میر تقی میر نے قافیے کی مجبوری کے سبب "طوطے" کی جگہ "توتے" نظم کیا ہے:

اس نے دیکھا جو اٹھ کے سوتے سے ٭ اڑ گئے آئینہ کے توتے سے

مگر کم و بیش اسی برس سے اُردو کی ریڈروں میں "ط" سے طوطا لکھا جا رہا ہے۔ طوطا بھی بولتا ہے اور طوطی بھی بولتی ہے۔ اُردو کا مروج و مقبول املا "توتا" نہیں "طوطا" ہے۔

۴۔ صفحہ ۱۷۵ پر میرے مضمون میں "منہندی" ٹائپ ہوا ہے، دوسرا "ن" زائد ہے۔ "مہندی" صحیح ہے۔

۵۔ صفحہ ۱۷۸ پر "استحسان" کے معنی بیان کرتے ہوئے قوسین میں "اصول فقہ اہل سنت" لکھا گیا ہے جو درست نہیں ہے۔ "اصول فقہ حنفی" ہونا چاہیئے۔ حنفی، مالکی، شافعی اور حنبلی یہ اہل سنت ہی کے فقہی مذاہب ہیں مگر "استحسان" کی اصطلاح فقہ حنفی کی اصطلاح ہے جس پر امام شافعی نے سخت تنقید کی ہے۔

۶۔ صفحہ ۸۸۳ پر "استخارہ" کی تشریح کے سلسلے میں یہ عبارت درج کی گئی ہے۔
"دیوان حافظ سے تفاول کرنا"

"استخارہ" شرعی اصطلاح ہے اور مسنون ہے مگر دیوان حافظ سے فال نکالنا دینی اور شرعی نقطۂ نگاہ سے درست نہیں ہے۔ دیوان حافظ تو ایک طرف رہا قرآن کریم سے بھی "تفاول" کی سند سنت نبوی اور آثار صحابہ میں نہیں ملتی۔ اس لئے راقم الحروف کی گذارش ہے کہ استخارہ کے معنی میں (۳) "دیوان حافظ سے تفاول کرنا" لغت سے نکال دیا جائے۔

۷۔ صفحہ ۸۸۵ پر "استخراج" کی تشریح میں ایک ضروری بات آنے سے رہ گئی۔ وہ یہ:
استخراج "فن حدیث" کی اصطلاح بھی ہے، مجموعہ حدیث کے مدون کا ذکر کیے بغیر احادیث کی روایت کا عمل "استخراج" کہلاتا ہے اور اس قسم کے مجموعہ احادیث کو "المستخرج" کہتے ہیں

۸۔ صفحہ ۸۹۲ پر "استدراک" کی تعریف و تشریح میں یہ بات ضرور آنی چاہیئے تھی جو نہیں آئی:
امام بخاری اور مسلم نے صحیح احادیث کے لئے کچھ اصول مقرر کئے تھے۔ ان کے بعد کے بعض محدثین نے انھی اصولوں کے پیش نظر بعض ایسی احادیث کا پتہ لگایا جو صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں آنے سے رہ گئیں۔ یہ احادیث جن مجموعوں میں جمع کی گئیں، ان کو "المستدرک" کہا جاتا ہے اور احادیث کی اس تلاش و جستجو کا نام "استدراک" ہے۔

۹۔ "اسی لئے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں" (۲۳)۔ بعض علماء دیوبند بھی اسی طرح لکھتے ہیں مگر اللہ تعالیٰ کی ذات واحد یکتا کے لئے جمع کا نہیں واحد صیغہ ہی استعمال کرنا چاہیئے۔ "اللہ تعالیٰ فرماتا ہے"

۱۰۔ "کافۃ للناس کے لئے بنایا جاتا ہے" (صفحہ ۲۲)۔ "کافۃ للناس" میں تو خود "کے لئے" معنی موجود ہیں۔ "کافۃ الناس" لکھنا چاہیئے تھا۔

۱۱۔ میں نے غالباً "اس سے پہلے بھی لکھا تھا کہ جو بھی نئی لغت مرتب کی جائے اس میں گزشتہ لغات کی غلطیوں کی اصلاح ہونی چاہیئے، اور یہ کام وہی لغت نویس حضرات کر سکتے ہیں جو زبان و الفاظ کے ذخائر پر نظر رکھتے ہوں: مثلاً نلانا یا نرانا کے معنی لغات میں۔ کھیت میں سے گھاس پھونس صاف کرنا۔ لکھے ہوتے ہیں۔ معنی میں "کھرپی" آنے سے رہ گیا، یوں:
"کھیت میں سے گھاس پھونس کھرپی سے صاف کرنا"

کوئی شخص کھرپی کے بغیر اپنے ہاتھ سے کھیت میں سے گھاس پھونس صاف کر دے تو اسے نرانا یا نلانا نہیں کہیں گے۔ کھیت نلانے (نرانے) میں گھاس پھونس صاف ہونے کے علاوہ کھیت کی مٹی بھی الٹ پلٹ ہو جاتی ہے جس سے فصل کی روئیدگی کو فائدہ پہنچتا ہے۔
کھیتی کی اصطلاح میں ایک لفظ "گربنا" ہے۔ صاحب فرہنگ آصفیہ اور صاحب نور اللغات

اس سے واقف ہیں، پلیٹس میں اس کے یہ معنی دیئے ہیں:

TO DIG — DIG UP — TO WEED

مگر یہ معنی بھی ناقص ہیں۔ کھرپی کے ذریعے کھیت کی تھوڑی مٹی اٹھا کر یعنی ذرا سا کھود کر، اُس میں تربوز وغیرہ کے بیج ڈال کر، مٹی برابر کر دینے کو "گربنا" کہتے ہیں۔ کھیت میں بعض بیج بکھیرے جاتے ہیں، بعض بوئے جاتے ہیں اور بعض بیج گربے جاتے ہیں۔

یہ معلوم کر کے بڑی خوشی ہوئی کہ "ترقی اردو بورڈ" نے چھاپنے کی مشین خرید لی ہے اور لغت کی چھپائی کا کام شروع ہونے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کی مدد فرمائے۔ والسلام

مخلص۔ ماہر القادری

حواشی

(۱) اصل سودے میں ممبروں ہے مگر شکستہ خط میں ہونے کے باعث متاسفانہ، "عبدوں" پڑھا گیا۔

(۲) "۱۹۴۸ء کے اختتام یا ۱۹۴۹ء کے آغاز" کی جگہ صرف "۱۹۴۸ء کے اختتام" کا آنا طباعت کی غلطی ہے۔

(۳) توتا چونکہ بالخصوص پاک و ہند کا پرندہ ہے اور ہندی میں "ط" نہیں ہے، اس لئے یہ شروع سے توتا ہی کہلاتا آ رہا ہے۔ آٹھارویں صدی کی کتابوں خصوصاً "توتا کہانیوں" و لغتناموں میں "توتا" ملتا ہے۔ فارسی کے لغات میں مرغ سخن گوئے ہندی یا ہندوستانی کو طوطی لکھا ہے۔ اور بعد کے لغتناموں میں توتا اور طوطا۔ طوطی تینوں شکلوں میں دیا ہے اور کوئی تخصیص نہیں بیان کی ہے۔ صرف "نوراللغات" نے یہ لکھا ہے: "اس کا املا طوطا صحیح نہیں ہے۔" چنانچہ میر تقی میر کے شعر میں، آئینہ کے یہی اپنے دیس کے توتے اُڑے ہیں، فارسی کے طوطے نہیں اُڑے! اس رعایت سے اُردو کے مروج املا میں، نقار خانے کے اندر دونوں قسم کے توتوں اور طوطوں کو بولنے دیا جائے۔

(۴) "منہندی" میں دوسرا نون سہو طباعت ہے۔ اصل سودے میں مہندی ہی تھا۔

(۵) استحسان کے معنی نمبر ۲ میں "اصول فقہ حنفی" کی ترمیم کر دی گئی۔

(۶) استخارہ۔ اگر بقول آپ کے قرآن کریم سے بھی تفاول کی سند، سنت نبوی اور آثار صحابہ میں نہیں ملتی تو چاہیئے کہ اس شق کو بھی بدعت سمجھ کر دیوان حافظ کی طرح خارج کر دیا جائے۔ مگر چونکہ یہ لغت فقہ یا فتووں کی کتاب نہیں، بلکہ لغات کا مجموعہ ہے، پس جیسے قرآن شریف استخارہ یا تفاول کے لیے نہیں آیا ہے اور لوگ اُس سے فال نکالتے ہیں، اسی طرح دیوان حافظ اور پشتونوں میں دیوان رحمان بابا سے تفاول کیا جاتا ہے اسلئے دونوں کا ذکر آنا چاہیئے

(۷) استخراج کے معانی میں آپ کے مجوزہ معنے شامل کر لیے گئے۔

(۸) "اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں"۔ اس میں شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی ذات واحد و یکتا کے لئے زمانہ قدیم سے واحد ہی کا صیغہ استعمال ہوتا آیا ہے، لیکن اب کچھ عرصہ سے بعض علما جمع کا صیغہ استعمال کرنے لگے ہیں۔ غالباً اپنے خیال میں وہ از راہ حد ادب ایسا کہتے ہیں۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے اپنے لئے "نحن" (یعنی ضمیر جمع متکلم) استعمال کی ہے۔ مگر وہاں اللہ تعالیٰ اپنی ذات کے متعلق مالکیت کے انداز میں استعمال کرتا ہے۔

(۹) استدراک کے معنوں میں آپ کے حسب فہمایش نشق شامل کر لی گئی۔

(۱۰) "کافۃ للناس" سہو طباعت ہے۔ چونکہ الناس اور للناس میں اشتباہ کا ہونا سہل ہے اس لئے پروف ریڈنگ میں بھی نظر انداز ہو گیا۔

(۱۱) نیرانا، نرانا اور نیلانا ہندی میں نراؤ نا ہے۔ کھیتی سے کوڑا کرکٹ دور کرنا۔ بچھوڑنا۔ صاف کرنا۔ نرانا کے معنوں میں کھرپے یا کھرپی کی تخصیص کسی نے نہیں کی ہے۔ صرف کھیت کے فالتو گھاس پھوس اور غیر ضروری یا مضر خود رو پودوں، جنھیں فارسی میں گیاہ بیگانہ

بھی کہتے ہیں۔ کوڑا کرکٹ صاف کرنا ہے، چاہے وہ ہاتھ سے ہو یا کسی آلے کے ذریعے ہو۔ اس میں گربنے کا عمل لازم نہیں۔ کھرپے سے جو عمل کیا جاتا ہے، جسے "گوڈی" بھی کہتے ہیں، زیادہ تر مکا (بڑی جوار) اور گنے کی فصل کے ابتدائی دنوں میں صرف ایک بار کیا جاتا ہے۔ مگر گنوں کے کھیت میں کدال سے کیا جاتا ہے البتہ سبزی ترکاری یا پھولوں کی کیاریوں میں یہ کام کھرپے یا کھرپی سے کیا جاتا ہے، جس میں فالتو گھاس پھوس ہٹانے کے علاوہ پودوں کی جڑوں کی سخت جمی ہوئی مٹی بھی اوپری کی جاتی ہے کہ جڑوں کو ہوا اور پانی بہ آسانی پہنچے "گربنا"، اپنے موقع پر آئے گا۔

(۱۲) ہم آپ کے مشوروں کے ممنون ہیں اور ان سے استفادہ کریں گے۔

شان الحق حقی

سُننے تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا

حضرت - سلامت

فاران برابر مل رہا ہے - آپ ماہر القادری صاحب کی اس یادگار کو قائم اور ان کی قائم کردہ اس روایت کو جاری رکھے ہوئے ہیں - یہ ایک مجاہدے سے کم نہیں ہے - یہ بھی وضعداری اور روایت کی پاسداری ہے - آپ جیسے بزرگوں کا دم بہت غنیمت ہے سو ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

آپکا مخلص
شبنم رومانی کراچی

مکرمی جناب مینائی صاحب - سلام مسنون

جولائی ۱۹۸۶ء کا فاران ملا - دوہری خوشی ہوئی - فاران کو بقید حیات دیکھ کر اور آپ کی "تلخ نوائی" پڑھ کر - یقین کیجئے میں تو آپ کی گزشتہ "تلخ نوائی" سے سخت پریشان اور مایوس ہو گیا تھا - اور اسی بنیاد پر اس سے پہلا خط لکھ دیا تھا جس میں کچھ بے سروپا باتیں بھی لکھ دی ہیں - خدا کا شکر ہے کہ فاران میں زندگی کی رمق ابھی باقی ہے اور آپ کا حوصلہ بلند ہے - الحمد للہ علیٰ ذالک -

کراچی میں فلاح یوتھ کلب کے زیر اہتمام مرحوم ماہر القادریؒ کے بارے میں مذاکرے کی خبر بھی دل خوش کن ثابت ہوئی اور یہ خبر بھی آپ اس مذاکرے میں پڑھے جانے والے مضامین اور منظوم عقیدتیں اگست کے شمارے میں شائع کر رہے ہیں - ماہر مرحوم کا ذکر مذاکرے کے حوالے سے پڑھ کر حسرت پیدا ہوئی کہ کاش میں بھی اس قابل ہوتا کہ اس مذاکرے میں شریک ہو سکتا اس حسرت نے مرحوم کی یاد میں جذباتی ہیجان پیدا کر دیا اور ایک نظم کی صورت اختیار کر لی - یہ نظم بھیج رہا ہوں مناسب ہو تو اسی کے ذریعے مجھے بھی "غائبانہ" اس مذاکرے میں شریک کر لیجئے -

جولائی کے شمارے میں ڈاکٹر محمد اقبال احمد خاں کا مقالہ "اصغر کا نظریۂ تنقید" واقعی بقول آپ کے ایک عہد آفریں مقالہ ہے - یہ بہت سے لوگوں کی اصغر مرحوم کے بارے میں ناقص معلومات کا ازالہ کرے گا - میں خود ابتدائے عمر سے اصغر کی شاعری کا شیدائی ہوں - ان کے سب دیوان اکثر میرے مطالعہ میں

(باقی صفحہ پر)

نیشنل بینک آف پاکستان نے جمع شدہ
رقوم پر قابلِ قدر مُنافع ادا کیا ہے۔
۳۰ر جون ۱۹۸۶ء کو ختم ہونے والی ششماہی کی شرح
مُنافع یہ ہے :-

شرح مُنافع فیصد - جنوری تا جون ۱۹۸۶ء

سیونگز بینک ———— ۷ء۳ فیصد
میعادی کھاتے
برائے ۵ سال یا زائد ———— ۱۳ء۴ فیصد

سہ ماہی	ششماہی	ایک سال	۲ سال	۳ سال	۴ سال
۸ء۴ فیصد	۹ء۵ فیصد	۹ء۹ فیصد	۱۰ء۸ فیصد	۱۱ء۷ فیصد	۱۲ء۶ فیصد

۷ دن اور ۳۰ دن کے نوٹس کھاتوں پر بالترتیب ۷ء۴ فیصد اور ۵ء۵ فیصد منافع دیا گیا

نیشنل بینک آف پاکستان قومی ترقی قومی بینک

United

PID-I-75/86

KPT

پاکستان کی
قومی بندرگاہ....

...پوری لگن کے ساتھ
قومی تجارت کے فروغ کے لیے
اپنی کوشش تیز سے تیز تر
کر رہی ہے۔

کراچی پورٹ ٹرسٹ
تجارت اور معیشت کی خدمت میں

کراچی پورٹ
پاکستان کی قومی بندرگاہ